بسم اللہ

# نگار

## جلد ۱۸ فہرست مضامین ماہ نومبر ۱۹۳۲ء شمارہ ۵


ملاحظات ــــــــ ۲
قرآن کے لطائف ادبیہ عبدالمالک آروی ۵
شعلہ زار الفت عزیز احمد ۳۴
کیا دنیا کو مذہب کی ضرورت ہے ــ ۳۹
ایک چتا میں دو شعلے عبدالسلام فاروقی ۵۲
آتش کے متعلق کچھ جدید تحقیق و تفتیش سراج الحق مچھلی شہری ۶۶
باب الاستفسار ــــــــ ۷۴
کہکشاں کے اس طرف بدرالدین اصلاحی ۸۴
مطبوعات موصولہ ــــــــ ۸۷
منظومات ــــــــ ۹۰
غزلیات ــــــــ ۹۲ تا ۹۵


**عرب اور اس کا مستقبل** مصنف فلسفۂ مذہب کی ایک اور معرکتہ الآرا کتاب جسمیں عربوں کے گذشتہ کارنامے اور ان کے سیاسی مستقبل پر بالکل نئے انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت مع محصول عہ (مینجر نگار)

# نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۸ نومبر سنہ ۱۹۳۰ء شمارہ ۵


## ملاحظات

میں آخرکار یکم نومبر کو پھر اُسی سرزمین فکر و آلام میں پہونچ گیا، جہاں سے سولہ دن قبل اُس دیار دور افتادہ کی طرف روانہ ہوا تھا، جو حقیقی انسانیت کے بہت سے فراموش کردہ مناظر اب بھی اپنے سنگستانی دامن میں چھپائے ہوئے ہے۔

سرحد جاکر وہاں کی زندگی، وہاں کی تہذیب، وہاں کی معاشرت اور سب سے زیادہ وہاں کی سیاسی کیفیات کے مطالعہ کرنے کا شوق عرصہ سے دل میں موجزن تھا اور ناشکری ہوگی اگر میں یہ کہوں کہ باندازۂ شوق اس میں زیادہ ناکامیاب رہا۔

میرا سفر یہاں سے اُس تاریخ کو شروع ہوا جب وہاں کی فضا میں سکون تھا، اور سیاسی مطلع گرد و غبار سے پاک، لیکن پشاور پہونچتے ہی مجھے یہ خبر سُنائی گئی کہ اب حالت زیادہ نازک ہوگئی ہے، اور نہیں کہا جا سکتا کہ امن و سکون کی صحبتوں میں کس قدر برہمی پیدا ہو۔ کہنے والوں نے تو اس کا اظہار تاسف کے ساتھ کیا، لیکن میں اپنی جگہ مسرور تھا، کیونکہ سرحد کا سفر کوئی معنی ہی نہیں رکھتا، اگر وہاں بھی اسی اطمینان و آئین زندگی سے واسطہ پڑے، جو بسا اوقات انسان کو تھکا کر کبھی کبھی جرم و معصیت پر بھی آمادہ کر دیتا ہے، چہ جائیکہ خطرے میں پڑنا، کہ میں تو اس کے اندر بہت سے حیات بخش لمحات اپنے لئے مستور پاتا ہوں۔

پھر یہ کہ میں نے اپنے دوران قیام میں وہاں کیا کیا دیکھا، کن کن تاثرات کو اپنے ساتھ لایا، یہ ایک مستقل بیان چاہتا ہے، جس کو میں آئندہ کے لئے اُٹھا رکھتا ہوں، کیونکہ ممکن ہے مجھے اس سلسلہ میں بعض تصاویر کا دینا بھی ضروری

ہو جائے۔ اسقدر ذکر میں نے صرف اس لئے کر دیا کہ ناظرین نگار کو میری واپسی کا علم ہو جائے اور اُن احباب کو مایوسی، جو مجھے واپسی کے وقت مختلف مقامات پر روکنا چاہتے تھے۔ متعدد تجربات کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ کسی متعین مقام کا عزم کرنے کے بعد راستہ میں کسی اور جگہ قطع سفر کر کے قیام کرنا تقریباً ناممکن سی بات ہے۔ اور میں آئندہ بھولکر بھی کوئی وعدہ ایسا نہ کرونگا کہ آخر کار معذرت کی ضرورت پڑے۔

---

اس سے قبل ناظرین نگار کو معلوم ہو چکا ہے کہ ہمارے صوبۂ متحدہ میں گورنمنٹ نے اُردو و ہندی زبانوں کی خدمت کے لئے ایک اکاڈیمی قائم کی ہے اور خزانۂ حکومت سے سالانہ معقول امداد اس کو ملتی ہے، اس کا نظام کیا ہے، اور اکاڈیمی کیا تدابیر خدمت زبان کے لئے اختیار کر رہی ہے۔ اس کی تفصیل یا اس پر تنقید کسی دوسرے وقت پر ملتوی کرتا ہوں۔ فی الحال میں ایک اور مسئلہ پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔ جسکو ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔

اکاڈیمی کے دستور اساسی و نظم عمل میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ ایک جریدہ ایسے لٹریچر کے ساتھ پیش کیا جائے جو ایک طرف حقیقی معنے میں اکاڈیمی کی شہرت و وقار کو قائم رکھنے والا ہو اور دوسری طرف واقعی خدمت زبان اس سے مقصود ہو۔ چنانچہ اب قیام اکاڈیمی کے تقریباً چار سال کے بعد یہ تحریک بروئے کار آ رہی ہے اور ایک سہ ماہی رسالہ کا اجراء وہاں سے ہو رہا ہے لیکن قبل اسکے کہ وہ جاری ہو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعد اشاعت، حدود تنقید کو تنگ کرنے کے لئے، قبل اشاعت ہی ان مشوروں کو پیش کر دیا جائے، جو اپنی توقعات کے لحاظ سے ہم پیش کر سکتے ہیں۔

یہ حقیقت غالباً ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں کہ جب سے اُردو ہندی زبان کی تفریق و نزاع شروع ہوئی ہے، اُسوقت سے ایک خاص جماعت ارباب فکر کی ایسی پیدا ہو گئی ہے جو ان دونوں میں رشتۂ اتحاد پیدا کرنیکی مدعی ہے اور جہاں تک اُردو انشا کا تعلق ہے وہ چاہتی ہے کہ اُسکو اس قدر سہل و آسان بنا دیا جائے کہ غیر مسلم یا غیر عربی و فارسی داں حضرات بھی بغیر کسی تکلیف کے آسانی سے سمجھ سکیں۔ یہ تجویز یا نیت لظاہر نہایت خوشنما اور دلپذیر معلوم ہوتی ہے، لیکن ایک نگاہ غائر اس تجویز میں چند در چند نقائص محسوس کر سکتی ہے۔ اچھا اب آیئے عملی نقطۂ نظر سے اس خیال کا تجزیہ کریں اور دیکھیں کہ نتیجہ کس صورت میں رونما ہوتا ہے۔

اگر اُردو انشا کو سہل بنایا جائے، یعنی عربی فارسی الفاظ ترک کر کے عوام کی نہایت ہی آسان زبان استعمال کیجائے، تو اس کے معنے صرف یہ ہوں گے کہ اُردو میں جو کچھ لکھا جائے اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر لکھا جائے جسے عوام کی ذہنیت کہتے ہیں۔ یعنی اُردو میں سوائے معمولی قصے کہانیوں، داستانوں، افسانوں اور بعض ابتدائی علوم کے مبادیات کے کسی اور سنجیدہ و دقیق مبحث پر گفتگو نہ کیجائے۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ اُردو بولنے اور لکھنے والی جماعت کو (جس میں عنصر غالب مسلمانوں کا سمجھا جاتا ہے) مطلقاً تربیت ذہن و دماغ کی ضرورت نہیں ہے اور ان کو ہمیشہ سطحیات میں مبتلا رکھنا چاہیئے

تاکہ وہ بدستور جاہل بنے رہیں۔ اور اُن میں دقیق مسائل پر سوچنے اور خود اپنے اندر ذہن خلاق پیدا کرنیکی اہلیت نہ پائی جائے۔

ممکن ہے بعض لوگوں کو تعجب ہو کہ میں اس نتیجہ پر کیونکر پہونچا، لیکن ادنےٰ تامل سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ خیال کی بلندی وقت از خود زبان کو بلند و دقیق بنا دیتی ہے۔ اگر ہم زندگی کے نہایت معمولی روز کے واقعات بیان کریں تو آسان زبان کافی ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر ہم علم الحیات، نفسیات وغیرہ دیگر علوم دقیقہ سے بحث کریں گے۔ یا خود انشاء کے اندر نازک خیالی اور بلندیِ تخیل سے کام لیکر زبان کو معانی جدیدہ، اور نکات نادرہ سے آشنا کرنا چاہیں گے تو زبان خود دشوار ہو جائے گی۔ اور ہم مجبور ہونگے کہ عربی فارسی کے الفاظ اور ان کے ترکیبی فقروں سے کام لیں۔

یہ امر مسلم ہے کہ ہر موضوع کے لئے ایک مخصوص زبان ہوا کرتی ہے، جو زبان ہم ایک افسانہ میں استعمال کرتے ہیں، کیا وہ نفسیات کے کسی مضمون کے لئے مناسب ہو سکتی ہے، کیا جس زبان میں ہم مذہبی مسائل کا ذکر کرتے ہیں، وہ ایک سیاسی خطیب کے لئے موزوں ہے۔ الغرض اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ معانی و مطالب کے اشکال کے ساتھ ساتھ زبان کا بھی اشکال بڑھتا ہے اور اس لئے یہ مشورہ دینا کہ اُردو کو نہایت سہل اور حد درجہ عوام پسند بنا دیا جائے۔ یہی معنی رکھتا ہے کہ اسکو علمی بلند زبان بنانے سے احتراز کرنا چاہیئے۔

اس نوع کا مشورہ دینے والے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ مسلمانوں کا ہے، جو فارسی عربی سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتا اور جس نے اپنے گہوارہ ہی میں انگریزی ماحول کو دیکھا دوسرا گروہ ہندوؤں کا ہے، جو اُردو زبان میں عربی فارسی الفاظ کا استعمال کیا معنے یہ بھی گوارا نہیں کرتا کہ اُردو رسم الخط قائم رہے۔ اگر ہندوؤں کی یہ ذہنیت صرف اس بناء پر ہوتی کہ اُن کو عربی فارسی سے قدرتاً کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ تو وہ زیادہ قابل الزام نہ تھے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی اس تحریک میں سیاسی غرض پنہاں ہے۔ اور وہ ہندی کو ترقی دینے کیلئے جنگ کے ان تمام اصول سے کام لے رہے ہیں۔ جو حصول مدعا کے لئے کسی نہ کسی نہج سے مفید ہو سکتے ہیں۔ اس کا ثبوت فراہم کرنے کے لئے زیادہ وقت نظر کی ضرورت نہیں ہے۔ گذشتہ دس سال کے اندر ہندی لٹریچر نے جو صورت اختیار کی ہے، وہ ایک ایسی قوی شہادت ہے، جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اگر ہندو جماعت کے سامنے اردو زبان کو سہل بنانے کی کوشش میں دونوں جماعتوں کا اتحاد خیال و زبان مقصود ہوتا، تو چاہیئے تھا کہ وہ ہندی میں بھی اسی اصول پر کاربند ہوتے یعنی جس طرح وہ اردو کو عربی و فارسی کے الفاظ سے بیگانہ کرنا چاہتے ہیں، اسی طرح وہ ہندی کو بھی سنسکرت کے ثقیل الفاظ سے نا آشنا رکھتے، لیکن کس قدر حیرت ہے کہ ایک طرف تو وہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ تم اپنی زبان کی خصوصیات کو ترک کر کے اس کو ہندوستانی زبان بناؤ، لیکن دوسری طرف جسوقت ہندی زبان کا مسئلہ اُنکے سامنے آتا ہے۔ تو وہ کوئی دقیقہ اسکو دشوار بنانے کی کوشش میں نہیں اُٹھا رکھتے اور اسکو ہندوستانی زبان بنانے کے بجائے دیو ناگری بنانے میں مطلقاً کوئی تامل نہیں ہوتا۔ اول اول جسوقت اُردو ہندی کی نزاع شروع ہوئی تو دنیا کو بتایا گیا کہ یہ صرف رسم الخط کی تبدیلی ہے اور انشا کے لحاظ سے ہندی میں اُردو سے کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن بعد کو رفتہ رفتہ حجاب اٹھتا گیا

اور یہ حقیقت آخر کار ظاہر ہو کر رہی کہ جس چیز کو صرف رسم الخط کا امتیاز کہا جاتا تھا، اس میں تینوں کا کھوٹ شامل تھا، اور وہ امتیاز حقیقتاً مذاہب کا اختلاف تھا، تمدن و معاشرت کا اختلاف تھا، اور اس عصبیت کا اختلاف تھا جو ایک مسلمان کے دل سے تو محو ہو سکتی ہے، لیکن ایک ہندو جو مسلمان کو ہندوستان کا غیر مستحق باشندہ سمجھتا ہے کبھی اس سے منفک نظر نہیں آسکتا۔

پھر آج ہندی کے رسالوں کو اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اُردو زبان کو سہل بنانے کا درس دینے والے، خود ہندی زبان کو مسلمانوں کے لئے کس درجہ ناقابل فہم معمہ بناتے جاتے ہیں۔ اور اُردو کے وہ معمولی الفاظ بھی جو حقیقتاً سنسکرت ہی کی بگڑی ہوئی صورت رکھتے ہیں، کس طرح ترک کئے جا رہے ہیں۔ کیا انصاف کا یہی تقاضا ہے۔ کیا صداقت اسی طرزِ عمل کی مقتضی ہے اور کیا دونوں قوموں کو متحد دیکھنے کی آرزو اسی طریق کار سے پوری ہو سکتی ہے۔

مجھ سے زیادہ دونوں قوموں کے اتحاد کا شاید ہی کوئی حامی ہو، لیکن میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ اُس کے لئے دونوں قوموں کو اپنی زبان کی خصوصیات بدلنے کی بھی ضرورت ہے۔ البتہ بجائے اسکے اگر اس امر کی تبلیغ کیجائے کہ دونوں جماعتیں دونوں زبانوں کا اتنا علم حاصل کریں کہ وہ ایکدوسرے کے علوم سے مستفید ہو سکیں تو بیشک میں اسکو ایک نتیجہ خیز بات کہہ سکتا ہوں۔ اسکے کوئی معنی نہیں کہ ہندو جماعت اُردو کو تو تہی مایہ بنانے کی کوشش کرتی رہے اور ہندی کے باب میں وہ اس اصول کو ترک کرکے اختلاف زبان کی خلیج کو اور زیادہ وسیع کرتی جائے۔

ہندو جماعت میں اول تو اردو کے انشاپرداز بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ فسانہ نگاری سے آگے نہیں بڑھے، لیکن گذشتہ دس سال کے اندر اُنھوں نے جس قدر تغیر اپنی اُردو میں پیدا کر لیا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ مسٹر پریم چند اُردو کے مشہور فسانہ نگار ہیں لیکن اب سے چند سال قبل کے افسانے اُن کے دیکھئے اور پھر اُن سے مقابلہ کیجئے اُن کے موجودہ افسانوں کا تو معلوم ہوگا کہ زبان و خیال دونوں حیثیتوں سے اک تغیر عظیم ان میں پایا جاتا ہے، اور وہ ذہنیت جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں، پوری طرح نمایاں ہو گئی ہے۔ نولکشور پریس کی طرف سے جو اُردو کی ریڈریں تیار کی گئی ہیں ان کو ملاحظہ کیجئے کہ مسٹر پریم چند نے کس بیدردی کے ساتھ اردو کو ذبح کیا ہے اور خیال و زبان دونوں اعتبار سے اس میں کس قدر نقائص پائے جاتے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ اول اول جب یہ ریڈریں لکھی گئیں تو ان کی زبان کافی سادہ تھی۔ لیکن تھی اُردو۔ مگر جب جناب پریم چند کے سامنے حکِ اصلاح کیلئے آئیں تو اُنھوں نے کوئی دقیقہ انکی زبان کو مسخ کرنے کا اُٹھا نہ رکھا۔ یقیناً پریم چند صاحب اُردو میں فسانہ لکھتے ہیں اور اچھا لکھتے ہیں لیکن انکو اُردو زبان کا ماہر یا صاحب نظر مصنف تو نہیں کہہ سکتے۔ وہ یقیناً نہیں سمجھ سکتے کہ اُردو کی خصوصیات کیا ہیں، عربی فارسی ترکیبوں پر اسکی معنوی خوبی کا کسقدر انحصار ہے۔ اگر وہ عربی فارسی کے جاننے والے ہوتے، اگر وہ بجائے فسانوں کے علمی یا تنقیدی مضامین بھی لکھتے تو انکو معلوم ہوتا کہ اُردو کو کسی طرح عربی فارسی سے بے نیاز نہیں بنایا جا سکتا، جسطرح وہ خود اپنے ہندی مضامین کو سنسکرت کی ترکیبوں سے خالی نہیں کر سکتے۔ یہ میں نے اسلئے ظاہر کیا کہ اگر کوئی شخص جواب میں پریم چند صاحب کی انشا کو پیش کرے تو پہلے ہی اسکو میرا جواب بطور رفع دخل معلوم ہو جائے۔

اس قدر تمہید و تفصیل کے بعد میں اب ہندوستانی اکاڈمی، اُسکے ممبران، اور رسالہ کے اڈیٹران سے خطاب کرکے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اکاڈیمی کی طرف سے جو سہ ماہی رسالہ اُردو کا جاری ہونیوالا ہے، وہ کس ذہنیت کے ماتحت شائع ہوگا اور ملک و قوم کو اُسکی طرف سے کیا توقعات قائم کرنا چاہیئے۔

چونکہ خود مجھے بھی اکاڈمی کے ممبر ہونے کی عزت حاصل ہو چکی ہے اور میں اس ذہنیت سے اچھی طرح واقف ہوں جو زبان کے متعلق وہاں کی فضا میں پائی جاتی ہے۔ اسلئے مجھے اندیشہ ہے کہ زیر تجویز رسالہ کہیں غلط اصول پر نہ جاری کیا جائے اور بالارادہ بھی سیاسی اغراض کا شکار ہو جائے۔ اس اندیشہ کی تصدیق اُس روایت سے بھی ہوتی ہے جو مسٹر دیانرائن نگم سے بواسطہ جناب مشیر احمد صاحب علوی مجھ تک پہونچی ہے کہ اس رسالہ کا نام صرف ہندوستانی ہوگا اور اسپر بجائے سہ ماہی رسالہ کے "تہ ماہی رسالہ" درج کیا جائے گا (معلوم نہیں مینے تہ ماہی لکھنے میں صحیح رسم خط استعمال کیا ہے یا نہیں۔ ممکن ہے وہ اسکو ترماہی لکھیں)۔ مجھے اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ تجویز پروفیسر صدیقی صاحب کی ہے۔ میں پروفیسر صدیقی سے واقف نہیں ہوں اور غالباً میری طرح کوئی اور بھی اُنکی خدمت زبان کے کارناموں سے آگاہ نہیں ہے۔ لیکن پروفیسر صدیقی کی طرف سے اس تجویز کا پیش ہونا محض اسوجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں) قوم کے صحیح جذبات کی ترجمانی نہیں ہو سکتی، جبکہ معلوم ہے کہ وہ اپنے مصالح مقامی کے لحاظ سے کبھی اسکی جرأت نہ کر سکتے تھے کہ ارباب اکاڈمی کے ہندو عنصر کے خلاف مزاج کوئی تجویز پیش کر سکیں۔ مسلمان لاکھ بیوقوف سہی لیکن زمانہ نے اُن کو اتنا باخبر ضرور کر دیا ہے کہ وہ اس نوع کے تحریک و تجویز کی اہمیت اور اُسکی شاطرانہ چال کو نہ سمجھ سکیں۔

حکومت کی طرف سے اکاڈمی کو جو امداد ملتی ہے وہ صرف ترقی زبان کے لئے ملتی ہے اور اس مقصد کے تحت میں کوئی اور غرض شامل نہیں ہے۔ پھر اصولاً صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ اُردو کی ترقی کیونکر ممکن ہے۔ اگر سہ ماہی کو تماہی کرنا علامت ترقی میں شامل ہے صرف اسوجہ سے کہ اسطرح فارسی لفظ سہ محو ہوتا ہے تو ہندی رسالہ میں بجائے کسی اور سنسکرت ترکیب کے سہ ماہی لکھنا چاہیئے۔ تاکہ وہاں سے سنسکرت عنصر کم کیا جائے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہندی رسالہ میں تو وہ تمام اغلاق روا رکھا جائے، جسکو یقیناً اکثر ہندو حضرات بھی نہیں پسند کر سکتے لیکن اُردو سے اُن معمولی عربی فارسی کی ترکیبوں کو بھی نکالدیا جائے جو ہندو زبانوں پر بھی عرصہ سے رائج چلی آتی ہیں۔

میں پوچھتا ہوں کہ وطن کے بجائے اردو میں جنم بھوم کیوں لکھا جائے، زیور کی جگہ بھوشن کو کیوں رائج کیا جائے، موسم و وقت کے بجائے سمے کا کیوں استعمال ہو۔ لیکن کی جگہ پرنتو کیوں لکھا جائے، کیا کوئی ہندو ایسا ہے جو اس سے انکار کرے کہ وہ وطن، زیور، موسم، اور لیکن کا مفہوم نہیں جانتا اور روز کی زندگی میں وہ بجائے ان الفاظ کے جنم بھوم، بھوشن، سمے اور پرنتو کا استعمال کرتا ہے، پھر جب مقصود یہ ہے کہ زبان کو سہل الفہم بنایا جائے تو وہ الفاظ جاریہ کو قائم رکھنے سے حاصل ہوتا ہے یا اُن میں غیر مانوس تبدیلی کرنے سے؟ میں پوچھتا ہوں کہ سہ ماہی میں کیا خرابی یا اشکال ہے جو اُسکو تماہی بنایا جا رہا ہے اور اس سے مدعا کیا ہے؟

بہرحال میں ارباب اکاڈمی کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر وہ اُردو رسالہ جاری کرنا چاہتے ہیں تو اُس کے ارباب نظم و نسق میں سے تماہی ذہنیت رکھنے والے عناصر کو بالکل علحدہ کر دیں، کیونکہ یہ لوگ یقیناً اُردو کے بہی خواہ نہیں ہیں اور اسکو انھیں خصوصیات کے ساتھ جاری کریں جو اس کو عام سطح سے بلند کرنیوالی ہے۔ یقیناً اس میں عام سطحی افسانوں کے علاوہ علمی و تنقیدی مضامین بھی درج کئے جائینگے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ان مضامین کی جو زبان ہوگی وہ کسیطرح تماہی کی ہم آہنگ نہیں ہو سکتی، اور اس میں عربی و فارسی الفاظ و تراکیب کا ضرورتاً و مجبوراً استعمال یقیناً ہوگا۔ پھر جب اس کوشش کا کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا تو میں حیران ہوں کہ صرف سہ ماہی کو تماہی کر دینے سے جذبۂ اصلاح کیونکر پورا ہو سکتا ہے البتہ اگر وہ اکاڈمی کے رسالہ کو صرف بچوں کا کھیل اور ادنےٰ درجہ کے معمولی و سطحی مضامین کا مجموعہ بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اس سے کوئی واسطہ

نہیں، خواہ اسکا نام تم ہی رکھیں یا ڑی ماسی پترکا، البتہ اُسوقت یہ مطالبہ ضرور کیا جاسکتا ہے کہ کیا حکومت کی امداد کا مصرف صحیح یہی ہے اور کیا جو رقم اردو زبان کی ترقی کے لئے دیجارہی ہے، اُس کو اسطرح فی الحقیقت ہندی زبان کی اُستواری میں صرف نہیں کیا جاتا

جو کچھ مینے عرض کیا وہ بالکل خلوص نیت لیکن پوری آزادی رائے کے ساتھ ظاہر کیا ہے، لیکن اگر اسکو عصبیت کے رنگ میں دیکھا جاسکتا ہے، تو میں باوجود اپنی اس تمام حریت رائے کے جو مذاہب مسالک اور ملل واقوام کے باب میں ہر شخص پر ظاہر ہے اُسکو عصبیت تسلیم کرنے پر بھی آمادہ ہوجاؤں گا، اور کبھی اسکو گوارا نہ کرونگا کہ اُردو زبان کو سیاسی اغراض کا نشانہ بنایا جائے اور اسکو ترقی دینے کے بجائے مسمار و منہدم کیا جائے۔

---

گول میز کانفرنس کے انعقاد کے لئے تمام تمہیدی تیاریاں ہو رہی ہیں، اور ہندوستان کے سیاسی اضطراب کے انحطاط سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ جو فضا وہاں پیدا ہو رہی ہے وہ شاید یہاں کی حقیقی امیدوں کے خلاف نہیں ہے۔

اگر آزادی کامل کا مطالبہ "بہ مرگش بگیر" کے اُصول پر صرف ڈومی نین ہوم رول کے حصول کو متعین کرنے کیلئے نہ تھا۔ تو ہمیں اسکی موت پر افسوس ہے، جسکے آثار اول اول اسیوقت پیدا ہو چلے تھے جب مہاتما گاندھی نے گفتگوئے صلح کے لئے اپنی آمادگی کا اظہار کیا تھا۔

یہ امر بڑی حد تک یقینی ہے کہ گول میز کانفرنس میں ہندوستان کو ہوم رول دیئے جانیکی تجویز پاس ہو جائے گی، جو رفتہ رفتہ تدریج کے ساتھ تکمیل کی حد تک پہونچے گی۔ ہندوستان کی ماڈریٹ جماعت جسکو کانفرنس میں پوری نمایندگی حاصل ہے، اس عطیہ کو نہایت مسرت کے ساتھ قبول کرے گی۔ اور اسے قبول کرنا چاہیئے، لیکن میرا خیال ہے کہ آخرکار آزادی کامل کے طلبگار بھی اس سے انحراف نہ کرینگے اور تنگ زرگری کے اُصول پر تنہائی میں باہم گلبنگیر ہو کر اپنی کامیابی پر ایک دوسرے کو مبارکباد کہیں گے۔

رہ گیا مسلمانوں کا مسئلہ، سو وہ بھی ایسا زیادہ "عقدۂ مشکل" نہیں ہے۔ ہر قوم اپنا مستقبل خود بناتی ہے اور خود ہی بگاڑتی ہے۔ چونکہ ہندو مسلمان ابھی تک ایک قومیت کے قائل نہیں ہیں اور دونوں کے درمیان افتراق کا فاصلہ برابر بڑھتا ہی جارہا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ دونوں قومیں اپنے مقاصد و اغراض بالکل جدا جدا رکھتی ہیں اور اسی خیال کے ماتحت دستور العمل بنا رہی ہیں؟ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟

اس سوال کا جواب بہت آسان ہے۔ دونوں کے حالات پر غور کرو اور سمجھ لو کہ نتیجہ کیا ہوگا۔ فطرت ہمدردی کے جذبہ سے بالکل معرّا ہے، اسوقت تک وہ خدا جانے کتنی قوموں کو تباہ کر چکی ہے اور آیندہ اسی طرح کرتی رہیگی، اس لئے اگر ہندوستان کی بھی کوئی ضعیف قوم صفحۂ ہستی سے مٹ جائے تو حیرت نہ کرنا چاہیئے۔ مخصوص اسباب کے ماتحت مخصوص نتیجہ پیدا ہونا ضروری ہے خواہ وہ کتنے ہی زبردست الہامی مذہب کے پیرو ہونے کا مدعی کیوں نہ ہو

---

# جنوری ۳۱ء کا نگار کیا ہوگا؟

گزشتہ ماہ کے رسالہ میں وعدہ کیا گیا تھا کہ آیندہ اشاعت میں اس کا اظہار کیا جائیگا۔ چنانچہ آج ہم بتانا چاہتے ہیں کہ جنوری ۳۱ء کا نگار کیا چیز ہوگا اور اس کو نہ حاصل کرنا کس چیز کو ہاتھ سے دیدینا ہے۔

جنوری ۳۱ء کا نگار۔ رسالہ نہیں ہوگا، بلکہ کتاب ہوگا اور ایک ایسے موضوع پر جو اس سے قبل اُردو زبان میں آیا ہی نہیں۔ جس طرح ہاتھ کی لکیروں کو دیکھ کر ایک شخص کے حالات معلوم کئے جاتے ہیں، اسی طرح آپ ایک شخص کے سوادِ خط کو دیکھکر اسکی سیرت کا حال معلوم کرسکتے ہیں۔ یہ فن بہت ترقی یافتہ فن ہے جسکی طرف ایشیا میں مطلق توجہ نہیں کی گئی۔

ہماری خواہش پر ایک صاحب نے جو اس فن کے ماہر ہیں اور عرصہ سے اس مسئلہ میں تحقیق و تفتیش کر رہے تھے ایک کتاب مرتب کی ہے، جس میں اس فن کی تاریخ، اور اس کے اُصول و روح کے اقسام تحریر سے بحث کی ہے، اور مثالوں سے نمونوں سے دستخطوں سے بتایا گیا ہے کہ ہم ایک شخص کا خط دیکھکر کیونکر اس کی سیرت اور اس کے مستقبل کو معلوم کرسکتے ہیں۔ اس علم کا نام فراست التحریر ہے۔ اور اُردو میں یہ بالکل پہلی کتاب ہے جو تکمیل کے ساتھ شائع ہو رہی ہے۔

اس کتاب کے علاوہ ایک طویل فسانہ مولانا نیاز فتحپوری کا ہوگا جس کا عنوان یہ ہے:۔

## داستانِ حسن و عشق کا ورق خونیں

اور

## جلوۂ بے محابا کی ایک قاتل رات

دوسرا افسانہ جناب مجنوں گورکھپوری کا خواب و خیال کے عنوان سے ہوگا۔ اسی کے ساتھ ایک اور معرکتہ الآرا بحث علمارِ ہند کے اُن فتاوی پر ہوگی جو مولانا نیاز کے ایک استفتا پر اُن کی طرف سے موصول ہوئے تھے۔

وہ حضرات جن کا چندہ نگار کا ختم ہو رہا ہے (خواہ وہ نومبر میں ختم ہو یا دسمبر میں) خریدار رہنے کی صورت میں حسب ذیل رعایت کے مستحق ہونگے۔ تذکرہ خندہ گل۔ شاعر کا انجام نصف قیمت پر دئیے جائینگے اور "سائنس کے عجائب" مفت۔ اسی کے ساتھ رسالہ جن کے گزشتہ پرچے مارچ ۲۹ء سے آیندہ تک بجائے ۸ر فی پرچہ کے ۲ر فی پرچہ کے حساب سے دئے جائیں گے۔ جو حضرات یہ تمام چیزیں طلب کرینگے اُن سے محصول ڈاک بھی نہ لیا جائے گا۔

"مینجر نگار"

# قرآن کے لطائفِ ادبیہ

(مسلسل)

## گنج قارون

گنج قاروں کہ فرو می رود از قہر ہنوز
خواندہ باشی تو کہ از غیرت درویشان است　　(حافظ)

سورۂ قصص میں قارون کا واقعہ بہ تفصیل مذکور ہے، یہاں پر اس واقعہ کے تین اجزا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، "گنج قارون" "فرو می رود از قہر" اور "از غیرت درویشاں" تینوں کے متعلق قرآن میں مفصلہ ذیل آیات ہیں،

| | |
|---|---|
| و آتینٰہ من الکنوز ما ان مفاتحہ لتنوء بالعصبۃ اولی القوۃ | اور ہمنے اسکو (قارون) اسقدر خزانے دئے تھے کہ انکی کنجیاں کئی کئی زور آور آدمیوں کو گرانبار کر دیتی تھیں۔ |
| فخسفنا بہ و بدارہ الارض | اور ہمنے اس قارون کو اور اُسکے محلسرا کو زمین میں دھنسا دیا |
| و ابتغ فی ما اٰتٰک اللہ الدار الاٰخرۃ ولا تنس نصیبک من الدنیا و احسن کما احسن اللہ الیک | اور تجھکو خدا نے جتنا دیا ہے اس میں عالم آخرت کی بھی جستجو کیا کر اور دنیا سے اپنا حصہ مت فراموش کر اور جس طرح خدا تعالےٰ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے، تو بھی احسان کر۔ |

اب معنی میں کوئی پیچیدگی نہیں معلوم ہوتی، حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ فقیروں کی غیرت ایسی ہے، کہ گنج قارون زمین میں برابر دھنستا چلا جا رہا ہے۔ ہر چند قرآن مجید میں یہ مذکور نہیں کہ وہ ابھی تک دھنستا جاتا ہے، بلکہ صرف ماضی کا صیغہ "فخسفنا" استعمال ہوا ہے، لیکن عربی زبان میں صیغۂ ماضی حال اور استقبال کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

بہرحال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا اگر علماء، اسلامی روایات سے اسکی تصدیق کردیں کہ قارون ہنوز زمین میں دھنسا جا رہا ہے، تو لفظ قرآن میں اسکی گنجائش موجود ہے، ورنہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ متاخرین کا اضافہ ہے، اور حافظ صاحب نے اپنے شعر میں قرآنی واقعہ کو اُسی عامیانہ وہم کی آمیزش کے ساتھ پیش کیا ہے۔

## اعجاز موسوی

موسیٰ کے ساتھ خضرؑ کا واقعہ متلازم ہے، اور شعرا نے اکثر کمالات موسیٰ کے سلسلہ میں خضر کا بھی تذکرہ کیا ہے، مگر چونکہ میں "خضر" پر آیندہ پوری بحث کرنا چاہتا ہوں، اس لئے اشعار کے اسی پہلو پر روشنی ڈالوں گا جس میں صرف موسیٰؑ کا تذکرہ ہے۔

بہر قبیے ز آتش گل شاخ شگوفہ　(جامی)　از جیب بروں کردہ چو موئے ید بیضا است

آں ہمہ شعبدہا عقل کہ می کرد آنجا　(حافظ)　سامری پیش عصا و ید بیضا می کرد

خریں از خامہ ات خیزد شرش وادی ایمن　(حزیں)　تجلی طور می سازد و نے آتش نوا ہا را

جائے کہ برقص آید طور از "ارنی" گفتن　(حزیں)　مستان لقا مانند بیہوشی موسیٰ را

جامی نے اپنی ایک غزل میں تسلسل مضامین کا لحاظ رکھتے ہوئے، گلگشت چمن اور نظارہ خیاباں کا نہایت عمدہ نقشہ پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک طرف غنچہ نے برقع اُتار دیا ہے، تو دوسری طرف نرگس ہمہ تن چشم بنکر محو تماشا ہے، گلاب کی ہری ہری ٹہنیوں میں جو "سوزن زنگار" ہیں وہ گویا میرے دل سے وہ کانٹا نکال رہے ہیں جو غم سے میرے جگر میں ٹوٹ کر رہگیا ہے۔

تا گل تتق غنچہ ز رخسار کشاد است　　نرگس ہمہ تن چشم شدہ بہر تماشاست
شبرہ کشد از سوزن زنگار گرفتہ　　خارے کہ شکستہ ز غم اندر جگر ماست

غضب کا زور بیان ہے اسکے بعد فرماتے ہیں۔

بہر قبیے ز آتش گل شاخ شگوفہ　　از جیب بروں کردہ چوں موئے ید بیضاست

یعنی شاخ شگوفہ، کھلے ہوئے (گلاب کے) پھولوں سے لپٹ رہی ہے، اور اسکا مقصد ہے کہ "آتش گل" سے کچھ لے، شاخ شگفتہ کا گلاب کے پھولوں پر ہوا کے جھونکوں سے جھوم کر گرنا ایسا منظر پیش کر رہا ہے، جیسے موسیٰ کے ید بیضا کے مبارک بال گریباں سے نکلنے کے بعد، فوراً چمک اوٹھے ہوں۔

یہاں پر اس لطیف خیال کے ساتھ جیسے عمدہ سے عمدہ محاسن ادب کا جزو کہہ سکتے ہیں جامی نے قرآن کے بیان کردہ واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے، اور تلمیح کے لئے قرآنی الفاظ بھی استعمال کئے ہیں، جب حضرت موسیٰ اپنی بیوی کے ساتھ وادی ایمن میں پہونچے تو آگ کی ضرورت ہوئی۔

اذ رأیٰ ناراً فقال لاھلہ امکثوا انی آنست ناراً لعلی آتیکم منھا بقبسٍ او اجد علی النار ھدیً (طٰہٰ)

جبکہ انھوں نے ایک آگ دیکھی، سو اپنے گھر والوں سے فرمایا کہ تم ٹھیرے رہو، مینے ایک آگ دیکھی ہے، شاید میں اس میں سے تمہارے پاس کوئی شعلہ لاؤں، یا آگ کے پاس رستہ کا پتہ مجھکو ملجائے۔

مولانا جامی نے جو لفظ "قبس" اپنے شعر میں استعمال کیا ہے، وہ قرآن سے مستعار ہے، اور بالکل اسی معنی میں جو قرآن کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے، یعنی گل بہ منزلہ آتش ہے، اور شاخ شگوفہ کو اس سے استفادہ کرنا ہے، اسی طرح جسطرح حضرت موسیٰؑ وادیٔ ایمن میں آگ دیکھکر "اٰتیکم منہا بقبس" فرماتے ہیں، دوسرے مصرعہ میں قرآن مجید کی ان آیات کی طرف اشارہ ہے، جن میں حضرت موسیٰؑ کے ید بیضا کا تذکرہ ہے، خصوصیت کے ساتھ یہ واقعہ سورۂ طٰہٰ، اور قصص میں بہ تفصیل مذکور ہے۔

واضمم یدك الی جناحك تخرج بیضاء من غیر سوءٍ — اور تم اپنا ہاتھ بغل میں دے لو، وہ بلا کسی عیب کے روشن ہو کر نکلے گا۔

دوسرے شعر (۲) میں حافظ نے جو تلمیح قرآنی پیش کیا ہے، وہ تاریخی اعتبار سے قابل جرح ہے۔

آں ہمہ شعبدہا عقل کہ می کرد آنجا ۔ سامری پیش عصا و ید بیضا می کرد

یعنی لطائف روحانیہ اور اعجازات ملکوتیہ کے نزدیک عقل کی رو و قدح وہی معنی رکھتی ہے، جو عصائے موسیٰ اور ید بیضا کے سامنے سامری کی، قرآن مجید میں جہاں سامری کا بیان ہے وہاں عجلاً جسداً لہ خوار آیا ہے اور اس نے اگر موسیٰ کی مخالفت کی تو یہی کہ انکی غیبت میں بنی اسرائیل سے بچھڑا کی پرستش کرائی، قد فتنا قومك من بعدك واضلھم السامری۔ ید بیضا اور موسیٰ کے مقابلہ میں فرعون کے ساحروں نے البتہ شعبدے کئے تھے۔

قالوا ان ھذان لسحران یریدان ان یخرجٰکم من ارضکم بسحرھما ویذھبا بطریقتکم المثلی ۔ فاجمعوا کیدکم ثم ائتوا صفاً — کہنے لگے کہ بیشک دونو جادوگر ہیں، انکا مطلب یہ ہے کہ اپنے جادو سے تمکو تمہاری سرزمین سے نکالدیں اور تمہارے عمدہ طریقہ کا ذکر ہی اٹھا دیں تو اب تم ملکر اپنی تدبیر کا انتظام کرو، اور صفیں آراستہ کرو۔

اس کے بعد انکے شعبدے اور نیرنجات کا تذکرہ ہے۔ فاذا حبالھم وعصیھم یخیل الیہ من سحرھم انھا تسعیٰ (پس یکایک اُن کی رسیاں اور لاٹھیاں انکی نظر بندی سے موسیٰ کے خیال میں ایسی معلوم ہونے لگیں، جیسے چلتی دوڑتی ہوں) تلمیح قرآنی سے انکار نہیں لیکن "سامری پیش عصا و ید بیضا شعبدہا می کرد" کا واقعہ قرآن میں نہیں، سامری کی مخالفت اور اس کا مردود بارگاہ نبوت ہونا اسوقت کا واقعہ ہے، جب حضرت موسیٰ طور پر تشریف لے گئے، ظاہر ہے کہ اس کے قبل آپ کو معجزات عصا و ید بیضا عطا ہو چکے تھے، اگر یہ کہا جائے کہ "ید بیضا اور عصا" سے خود ذات موسوی مراد ہے، تو بھی کہا جا سکتا ہے، کہ موسیٰ کے مقابلہ میں سامری نے تو نیرنجات سحر دکھائے نہ تھے، اور ید بیضا اور عصا سے ذات موسوی مراد لینے پر بھی "ید بیضا اور عصا" سے "شعبدۂ سامری" کو جدا نہیں کر سکتے۔

شیخ علی حزین نے اپنے پہلے شعر میں قرآن مجید کے دو بیان کردہ واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے، "آتش وادیٔ ایمن" اور "تجلی طور می سازد" دو فقرے قابل تشریح ہیں۔

فلما اتٰھا نودی من شاطیٔ الواد — سو وہ جب اس آگ کے پاس پہونچے تو ان کو اس میدان کے

الایمن فی البقعۃ المبارکۃ من الشجرۃ ان یاموسیٰ انا اللہ رب العالمین (قصص) — داہنی جانب سے اس مبارک مقام میں ایک درخت سے آواز آئی میں اللہ رب العالمین ہوں،

یہ ہے سروش وادی ایمن،

فلما تجلی ربہ للجبل جعلہ دکا و خر موسیٰ صعقا (اعراف) — پس انکے رب نے اس پر تجلی فرمائی تجلی نے اسکے پرخچے اڑا دئے اور موسیٰ بیہوش ہو کر گر گئے،

اور یہ ہے "تجلی طور می سازد"۔

اب حزیں کے شعر کا معنی صاف ہے، فرماتے ہیں، میرے قلم سے جو کچھ نکل رہا ہے، وہ گویا نطق الہامی ہے، اور اس گرانی الہام کے باعث میرا قلم طور کی طرح ٹوٹ رہا ہے "جعلہ دکا" یا میرا قلم طور کی طرح مہبط انوار الٰہی ہو رہا ہے۔

حزیں کے دوسرے شعر میں بھی دو فقرے قرآنی کے واقعات سے مستعار ہیں "طرازارنی گفتن بر قصل ید" اور "بیہوشی موسیٰ" موسیٰ نے کہا تھا رب ارنی انظر الیک لیکن تجلی کی تاب نہ لا سکے، اور بیہوش ہو گئے، "خر موسیٰ صعقا" شعر کا مطلب یہ ہے کہ میرا محبوب ایسا جمال بدیع رکھتا ہے کہ اگر اس کا پرتو طور پر پڑ جائے تو وہ بھی رقص میں آ جاوے، (یہ اشارہ ہے قرآنی آیت جعلہ دکا کی طرف) اور اس کے جمال کا نظارہ کرنیوالے سمجھ جائیں کہ موسیٰ کی بیہوشی کی حقیقت کیا تھی؟

## واقعات یوسفی

حضرت یوسف کے جزوی واقعات اس کثرت سے شعرائے فارس کے کلام میں پائے جاتے ہیں کہ ان کے یکجا کرنے سے حضرت یوسف کی پوری زندگی مرتب ہو سکتی ہے، فارسی غزلیات کے اندر جو تلمیحات قرآنیہ پائے جاتے ہیں وہ زیادہ تر سورہ یوسف سے مستفاد ہیں۔

| | | |
|---|---|---|
| نہ یوسفے بہ سفر رفت از پدر گریاں | نہ در سفر بہ سعادت رسید ملک و ظفر | (رومی) |
| کند بر تخت عزت جا چو از تن جاں بروں آید | بہ شاہی میرسد یوسف چوں از زنداں بروں آید | (حزیں) |
| مرا دل گفت گنج فقر داری در جہاں منگر | نعیم مصر دیدہ کس چہ باید قحط کنعانش | (خاقانی) |
| من چو یعقوب ز بس گریہ شدم دیدہ سفید | آخر آں یوسف گم گشتہ بہ زنداں چونست | (خسرو) |
| یعقوب را دو دیدہ ز حسرت سفید شد | آوازہ ز مصر بہ کنعاں نمی رسد | (حافظ) |
| دیری جنبد بشیرا مے باد بر کنعاں گزر | مژدۂ پیراہن یوسف ببر یعقوب را | (جامی) |
| چہ سود قافلہ مصر حسن یوسف | متاع عشق چو در کارواں کنعان است | (جامی) |
| گریہ را ذوقست کار زاتہمتے باعث نشست | ورنہ یوسف در گریباں است یعقوب مرا | (عرفی) |
| بہ کنعاں چشم پاکے در سراغ خویشتن دارد | نمی ماند بہ کف پیراہن یوسف زلیخا را | (حزیں) |

قرآن مجید میں جسطرح یوسف کی ابتدائے عمر سے عہد آخر تک کے حالات زندگی ایک جگہ مرقوم ہیں اسقدر

کسی پیغمبر کے حالات ترتیب وار نہیں ملتے، شعرائے فارس نے تقریباً قرآنی واقعات کے تمام اجزار کی طرف اشارے کئے ہیں، بھائیوں کے ساتھ جنگل میں جانا، قافلہ مصر، غلامی، فتنۂ عشق، زنداں، آزادی، جاہ و مرتبت، قحط تمام واقعات فارسی شعرا کے یہاں غیر مربوط طریقہ سے غزلیات کے اندر ملتے ہیں، چنانچہ امثلہ بالا سے یہ نظریہ ثابت ہو جاتا ہے،

رومی اور حزیں کے خیالات ایک ہی واقعہ پر مبنی ہیں، رومی کہتے ہیں کہ حضرت یوسف باپ سے روتے ہوئے جُدا ہوئے تو حکومت پائی، اس لئے انسان کو چاہیئے کہ عالم مادہ سے عالم روح کا سفر اختیار کرے، حزیں کا بھی یہی مطلب ہے، لیکن رومی کے پہلے اور حزیں کے دوسرے مصرعہ میں دو واقعات قرآنی کی طرف اشارہ ہے، رومی نے ابتدائے عمر کا واقعہ بیان کیا ہے، جب بھائیوں نے قافلہ مصر کے ہات یوسفؑ کو بیچ ڈالا، وشروہ بثمن بخس دراھم معدودہ حزیں نے حیات یوسفی کے آخری دور کی طرف اشارہ کیا ہے، جب قید خانہ سے چھوٹ کر دربار شاہی میں ایک معزز عہدہ پر فائز ہوئے اور آخر میں بادشاہ ہو گئے۔ وقال الملک ائتونی بہٖ استخلصہ لنفسی فلما کلمہ، قال انک الیوم لدینا مکین امین ۔ معنی کے اعتبار سے دونوں میں ایک ہی خیال ادا کیا گیا ہے، خاقانی نے بھی رومی سے ملتا ہوا خیال ظاہر کیا ہے۔ اور یہ یقیناً اُسوقت کا کلام ہے، جب دربار سے تعلق ترک کر دیا تھا، کہتے ہیں کہ میرے دل میں گنج فقیری ہے، یعنی قناعت ہے، اس لئے مجھے دنیا میں تلاش مال و دولت کی ضرورت نہیں، اور میرے گنج فقر کی یہی مثال ہے۔ جیسے "نعیم مصر" کہ اُسکے رہتے ہوئے اہل کنعاں (برادران یوسف) قحط کی مصیبت میں مبتلا نہیں ہو سکتے تھے، یہ اشارہ ہے قرآن کی آیت "الا ترون انی اوف الکیل وانا خیر المنزلین" کی طرف حضرت یوسف اپنے بھائیوں کو غلہ دیکر کہتے ہیں کہ ابکی مرتبہ آنا تو اپنے چھوٹے بھائی (ابن یامین) کو ساتھ لانا کیا نہیں دیکھتے کہ میں غلہ پورا دیتا ہوں، اور مہمان نواز ہوں، خسرو اور حافظ نے "وابیضت عینٰہ من الحزن" کی طرف اشارہ کیا ہے، البتہ معانی میں اختلاف ہے۔ خسرو کہتے ہیں کہ حضرت یعقوب کی طرح میری آنکھیں سفید ہو گئیں، نہیں معلوم میرا محبوب جسکے فراق میں، میں نابینا ہو گیا قید خانہ میں کسطرح ہے، حافظ کہتے ہیں میری آنکھیں حضرت یعقوب کی طرح حسرت دیدار میں سفید ہو گئیں، لیکن تعجب ہے کہ یوسفؑ مصر میں بادشاہ ہیں اور اسکی خبر کنعاں میں نہیں پہونچتی، جامی نے پہلے شعر میں قرآن مجید کی آیت "فلما فصلت العیر قال ابوھم انی لاجد ریح یوسف" اور "فلما ان جاء البشیر القٰہ علیٰ وجھہ فارتد بصیرا" کی طرف اشارہ کیا ہے، حضرت یوسفؑ نے پیراہن دیکر بھائیوں کو بھیجا ہے۔ کہ باپ کو خوشخبری دیں لیکن انلوگوں کے پہونچنے سے قبل حضرت یعقوب فرماتے ہیں انی لاجد ریح یوسف مجھے حضرت یوسف کی خوشبو آرہی ہے۔ دوسرے شعر میں جامی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے، کہ "قافلۂ مصر" اسوجہ سے "حسن یوسفی" سے مستفید نہ ہو سکا، کہ عشق تو کنعان میں تھا یعنی اہل قافلہ حسن ظاہری کے محاسن جانتے تھے، اور یعقوب اوصاف باطنی سے واقف تھے، اس لئے "حسن یوسفی" سے "تاجران مصر" کے اندر کوئی عشقیہ کیفیت نہیں پیدا ہوئی، یہاں سے وہ معرکۃ الآرا مسئلہ طے پا سکتا ہے، کہ قرآن مجید

نے جمال یوسفی کو اعجاز کی صورت میں پیش کیا ہے یا نہیں، جامی کے اس شعر سے جمال یوسف کے متعلق وہ ہیجان پیدا کرنیوالی بحث جو نگار میں شائع ہو چکی ہے، ایک حد تک پایۂ ثبوت کو پہونچتی ہے، چونکہ مولانا جامی کہتے ہیں کہ جمال یوسفی سے (جو عام سطح حسن سے بالاتر نہ تھا یا جسے اعجاز نہیں کہہ سکتے) عشق کی اثیری کیفیت کے فقدان کے باعث اہل قافلہ کو کوئی فائدہ نہ پہونچا یعنی مولانا جامی کے نزدیک حسن یوسف میں الیسا ظاہری بدیع نہ تھا، جسکے باعث قافلہ کو کوئی گہرا تاثر ہوتا بلکہ اثر پذیری کے لئے، "عشق کنعانی" یا بہ الفاظ دیگر حضرت یعقوب کے التہاب عشقیہ کی ضرورت بتاتے ہیں، جو یقیناً حسن صورت پر مبنی نہ تھا بلکہ حسن معنی پر مبنی تھا۔[۱۵]

عرفی کہتے ہیں مجھے رونے میں لذت ملتی ہے، اس لئے روتا ہوں، ورنہ یعقوب کی طرح میں اپنے "یوسف" سے جدا نہیں ہوں، میرا یوسف میرے گریبان میں ہے۔ یہاں حضرت یعقوب پر ایک شاعرانہ تعریض بھی ہے وہ یہ کہ حضرت یعقوب ایک وقت فراق یوسفی میں "یا اسفی علی یوسف" (ہائے افسوس، یوسف) کہتے ہیں روتے روتے نابینا ہو جاتے ہیں، حتی تکون حرضا او تکون من الھالکین اور پھر اسی دور فراق میں "انی لاجد ریح یوسف" کہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے انھیں غم و حزن میں لذت ملتی تھی، اس لئے روتے تھے اور بہانہ یہ تھا کہ فراق یوسفی ہے۔ اگر یوسف سے فراق ہی تھا تو "بوئے یوسف" کہاں سے محسوس کر رہے ہیں، اخیر میں کہتے ہیں زلیخا کے ہاتھ میں پیراہن یوسف نہ آسکا اسکی وجہ یہ تھی کہ یعقوب کا فیض باطن انکی نگہبانی کر رہا تھا، (واستبقا الباب وقدت قمیصہ من دبر (اور دونوں آگے پیچھے دروازہ کی طرف دوڑے اور زلیخا نے یوسف کی قمیص پیچھے سے پھاڑ ڈالا۔)

## حضرت عیسیٰ کا احیائے موتی و مائدہ سماء

شعرا نے "دم مسیح" کی اثر آفرینیوں کا بہت کثرت سے تذکرہ کیا ہے، چنانچہ ذیل کے اشعار سے یہ خیال واضح ہوتا ہے۔

لبت بہ خندہ مرامی کشد چہ بدبختم　　کہ داد خوئے اجل بخت من مسیحا را　　(عرفی)

باکہ ایں نکتہ تواں گفت کہ آں سنگیں دل　　کشت ما را و دم عیسی مریم با اوست　　(حافظ)

مرا چوں دعوت عیسیٰ ست عید ہر زماں در دل　　دلم قربان عید فقر و گنج گاؤ قربانش　　(خاقانی)

---

۱۵ مولانا نیاز مدظلہ نے جمال یوسفی کا انکار کیا تھا تو صرف اس بناء پر کہ قرآن مجید نے اسے اعجاز نبوت کی صورت میں نہیں پیش کیا اور نہ جمالیات کسی الہامی مذہب کا موضوع ہو سکتی ہے، اس ضمن میں انھوں نے اس حدیث کی صحت کا انکار کر دیا تھا جس میں حسن یوسفی کے متعلق سرور کائنات نے اظہار خیال فرمایا ہے، مجھے (مولانا کے) اس آخری خیال سے اتفاق نہیں اور نہ مولانا کو اپنے نظریہ کی تائید میں اسکی ضرورت ہے، حسن یوسف کے متعلق صحیح حدیث ہے، لیکن بحث تو یہ ہے کہ قرآن مجید نے اسے اس صورت میں نہیں پیش کیا جس صورت میں عام لوگوں نے خیال کر رکھا ہے، چنانچہ ایک مصری عالم ڈاکٹر زکی مبارک کا بھی یہی عقیدہ ہے۔

عرفی اور حافظ کا خیال "احی الموتی باذن اللہ" (آل عمران) پر مبنی ہے، (سورہ مایدہ میں اسکی تفصیل ہے) البتہ اسلوب بیان میں کچھ فرق ہے، عرفی کہتے ہیں میری بدبختی کی یہ انتہا ہو گئی کہ مسیح بھی میرے لئے باعث اجل بن رہا ہے، اس کا ایک "تبسم سحر آفریں" میرا شیرازۂ حیات منتشر کرنے کے لئے کافی ہے، حافظ کے بیان میں بالکل سادگی ہے، وہ کہتے ہیں میرا محبوب دم مسیح رکھتا ہے، لیکن باوجود اس کے اس نے میری جان لی، یہ ایک عجیب نکتہ ہے، خاقانی کہتے ہیں کہ فقر کی عید سے میرے اندر ایک ایسا نشاط باطن موجود ہے، کہ میں ہمیشہ دعوت عیسٰی کا لطف اٹھا رہا ہوں، اور ایسی عید پر "گنج گاؤ" بھی قربان ہے، خاقانی نے پہلے مصرعہ میں سورہ مایدہ کی آیت ربنا انزل علینا مائدۃ من السماء تکون لنا عیدا لاولنا وآخرنا وآیۃ منک (اے ہمارے پروردگار ہم پر آسمان سے کھانا نازل فرمائے کہ وہ ہمارے لئے یعنی جو ہم میں اول ہیں اور جو بعد ہیں سب کے لئے ایک خوشی کی بات ہو جائے، اور آپ کی طرف سے ایک نشان ہو جائے،) کی طرف اشارہ کیا ہے خاقانی کے شعر میں لفظ "عید" بھی قرآن سے مستعار ہے۔

میرے پاس کلیات خاقانی کا ایک نہایت عمدہ قلمی نسخہ ہے، جسکی تاریخ کتابت سے پتہ چلتا ہے، عہد ظفر میں لکھی گئی ہے، اس میں خاقانی کے تمام فارسی قصائد ہیں، مرقومہ بالا شعر کی شرح میں حاشیہ پر لکھا ہوا ہے،

"گنج گاؤ آنست کہ مردے در بنی اسرائیل پوست گاؤ بہ دینار ہائے زر پر کردہ، بہائے گاؤ دادہ بود، کما قولہ تعالےٰ اذ قال موسیٰ لقومہ ان اللہ یامرکم ان تذبحوا بقرہ و بعضے گویند کہ "گنج گاؤ" آنست کہ فریدوں در اثنائے راہ در زمین کشت زار یافتہ بود"

شارح کا پہلا نظریہ کسی طرح چسپاں نہیں ہو سکتا، سورہ بقرہ میں یہ واقعہ بہ تفصیل مذکور ہے، مندرجہ بالا آیت سے واقعہ کی ابتدا ہوئی ہے، اور یریکم آیتہ لعلکم تعقلون تک ختم ہوا ہے، فریدوں نے "گنج گاؤ" نہیں پایا تھا، بلکہ کہا جاتا ہے کہ یہ جمشید کا خزانہ تھا اور زمین کے اندر سونے چاندی کے بیل، بچھڑے، اور قسم قسم کے جانور تھے، بہرام گور نے اسے پایا اور کل فقیروں کو بانٹ دیا اور یہ نظریہ خاقانی کے فقرہ "گنج گاؤ قربانش" سے بھی پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتا ہے، "قربان" سے یہاں ذبح گاؤ مراد نہیں بلکہ وہی فقرا اور غربا کے درمیان میں تقسیم مراد ہے،

## حالات خضرؑ پر دینیاتی اور صنمیاتی نظر

فارسی شعرائے "خضر" کے متعلق بہت سی نکتہ سنجیاں کی ہیں[5] چونکہ اسلامی دنیا میں بعض احادیث کی بنا پر سورۂ کہف کے ایک واقعہ کو خضر ہی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، اس لئے اس مسئلہ میں فارسی شعرا کی تلمیحات قرآنیہ پر غور کرنے سے پہلے

---

[5] "خضر" کی بحث نگار میں ایک مرتبہ آچکی ہے، اور حضرت مولانا نیاز صاحب مدظلہ، اور حضرت مولانا عبد الماجد صاحب مدظلہ کے باہمی نزاع کفر و ایمان کی تاریخ بھی اسی مسئلہ سے شروع ہوئی، اور میں نے "شبیہ نیاز" (جو اخباری دنیا میں میری زندگی کا سب سے پہلا مضمون تھا) (بقیہ صفحہ ۱۶ پر)

ضروری ہے کہ خود خضر کی ہستی اور اُن سے متعلقہ واقعات پر تنقیدی روشنی ڈالی جائے، اس مسئلہ میں ہمارے سامنے علم و معارف، تحقیق و تنقید، واقعات و روایات کے مختلف پہلو نظر آتے ہیں۔

اپنی موجودہ تحقیق کی بنا پر ہم حالات خضر پر، مذہبی ضمیاتی اور شاعرانہ تین پہلوؤں سے بحث کر سکتے ہیں، مذہبی عنوان کے ماتحت قرآن مجید، صحیح حدیث، صوفی ادبیات ہیں، سورہ کہف میں موسیٰ کے سلسلہ میں ایک نہایت دلچسپ واقعہ مذکور ہے، امام بخاریؒ نے کتاب التفسیر میں اس واقعہ کو خضر اور موسیٰ کا واقعہ بتایا ہے، اور اسکی تائید میں بہت طویل حدیث روایت کی ہے، اسی طرح جامیؒ نے نفحات الانس میں احمد بن الحواری، اور ابو بکر کتانی کے سلسلہ میں تیسری اور چوتھی صدی کے افسانہ ہائے خضر کے متعلق بہت دل خوش کن باتیں لکھی ہیں، تاریخ فرشتہ میں بہ سلسلہ خسرو دہلوی خضر کا ایک دلچسپ واقعہ پایا جاتا ہے۔ اور جب ایک محقق کی نظر "انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن اینڈ ایتھکس" کے اس نظریہ پر پڑتی ہے، کہ قدیم اسرائیلی ادبیات میں خضر کا وجود تھا اور اس سلسلہ میں مقالہ نگار نے اعمال خضر کے متعلق جو واقعات بیان کئے ہیں وہ جامی کے بیان کردہ واقعات سے خاص مماثلت رکھتے ہیں تو نتیجہ نکلتا ہے، کہ تصوف اسلام پر یہودیت کا بھی اثر پڑا ہے، یونانی، بابلی اور اسرائیلی ضمیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دنیا میں خضر کے متعلق جو واقعات مشہور ہیں انکے بعض اجزاء سکندر اعظم کے فسانہ میں ہیں، اور بعض

---

(بقیہ صفحہ ۱۵) اسی نوک جھوک سے متاثر ہو کر لکھا تھا، اسمیں شک نہیں، مضمون لکھنے کی تحریک نگار بابت مارچ ۱۹۲۸ء کے اس نمبر سے ہوئی جس میں مولانا نیاز صاحب مدظلہ کی شبیہ شائع ہوئی تھی، ظاہر ہے کہ میری اخباری زندگی اور مستقل مضمون نگاری، ہندوستان کے دو نامور، اور فاضل ادیبوں کے رد و احتجاج کی پیداوار ہے، جسکے لئے میں دونوں حضرات کا مرہون منت ہوں، لیکن ساتھ ہی حضرات علماء سے یہ شکایت کرنے کو جی ضرور چاہتا ہے کہ قوم کے نوجوانوں کی علمی ہمت افزائی میں وہ بہت بخل سے کام لیتے ہیں، اور بعض حضرات کے متعلق تو میرا خیال ہے، کہ وہ نہیں چاہتے کہ کوئی طالب العلم انکے نقش قدم پر چلکر ادیب یا فاضل بننے کی کوشش کرے، اس معاملہ میں ایک ہستی کے ساتھ میری عقیدت اور نیائش پرستش کے حد تک پہونچ گئی ہے یعنی مولانا نیاز صاحب نے جس محبت قلبی، اور بزرگانہ اخلاص و عطوفت کیساتھ مجھے ادبی ذوق دلایا، وہ میری تمام زندگی کا واحد تجربہ ہے اور بعض اوقات یقیناً اصحاب جبہ و دستار کے مقابلہ میں حافظ کا یہ شعر پڑھ لینے کو جی چاہتا ہے ؎ بیا بہ میکدہ و چہرہ ارغوانی کن ٭ مرو بصومعہ کانجا سیاہ کارانند ٭ بات میں بات نکلتی ہے، دراصل فٹ نوٹ میں لکھنا چاہتا تھا کہ نگار بابت جون و جولائی ۱۹۳۰ء کے نمبروں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت مولانا نیاز صاحب مدظلہ نے اب ایک دوسرا ادبی شگوفہ جو حضرات علماء کی اصطلاح میں مذہب اسلام پر ایک جدید حملہ کے مترادف ہے، یہ کھلایا ہے کہ قرآنی قصص کو تاریخی اہمیت نہیں دیتے، بلکہ صاف یوں کہئے قصص قرآنی کے تاریخی پہلو سے وہ انکار کرتے ہیں، یہ کوئی جدید اعتراض نہیں ڈاکٹر ٹسڈل نے "ماخذ قرآنیہ" قرآن کے اکثر بیان کردہ قصص کو افسانہ، حکایات، اور اوہام و اساطیر بتایا ہے، میرے مخدوم مکرم جس وقت اس مسئلہ پر قلم اٹھائیں گے میں تفصیل سے مستشرقین کے اعتراضات قدیم، افسانوں کے تراجم، قرآنی قصص کا صحیح تاریخی پہلو پیش کرونگا۔ بحمد اللہ یہ مضمون میرے ذوق کی چیز بھی ہے، مجھے فخر ہے اور فخریہ کہتا بھی ہوں کہ "انشاء" میں حضرت مولانا میرے مخدوم بھی اُستاد ہیں، اس لئے اس معرکہ آرائی پر ناظرین نگار کو عجب لطف و نشاط ضرور دیجا سکتی ہے۔

حصے "اسرائیلی اوہام و اساطیر" میں پائے جاتے ہیں، جیمس کے قاموس المذہب و الاخلاق (انسائیکلو پیڈیا آف رلجن اینڈ ایتھکس) میں خضر کے متعلق ایک بسیط مقالہ ہے، جس پر ضیاباتی نقطہ نظر سے بحث کی گئی ہے، اس کا ترجمہ و تلخیص ہدیہ ناظرین ہے، مقالہ نگار نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی تائید "بابلی علم الاصنام والاوہام" اور "اسرائیلی عجیبات" سے بھی ہوتی ہے، جنکے نسخے ہمارے پیش نظر ہیں۔

حالات خضر پر بحث کرنیکے سلسلہ میں پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ قرآن نے اس پر کس انداز سے روشنی ڈالی ہے، اور مستشرقین یورپ نے اس ضمن میں قرآن مجید پر جو اعتراض کیا ہے، اس کی کہانتک اصلیت ہے؟ سورۂ کہف کے آٹھویں رکوع میں مفصلہ ذیل واقعات ملتے ہیں،

"اور وہ وقت یاد کرو جبکہ موسیٰ نے اپنے خادم سے فرمایا کہ میں برابر چلا جاؤں گا، یہانتک کہ اس موقعہ پر پہونچ جاؤں جہاں دو دریا آپس میں ملے ہیں، یا یوں ہی زمانہ دراز تک چلتا رہوں گا، پس جب وہ دونوں دو دریاؤں کے جمع ہونے کے موقعہ پر پہونچے، اس اپنی مچھلی کو وہ دونو بھول گئے، اور مچھلی نے دریا میں اپنی راہ لی، اور چلدی، پھر جب دونوں آگے بڑھ گئے تو موسیٰ نے اپنے خادم سے فرمایا کہ ہمارا ناشتہ تو لاؤ، ہمکو تو اس سفر میں بڑی تکلیف پہونچی، خادم نے کہا کہ لیجئے دیکھئے جب ہم اس پتھر کے قریب ٹھیرے تھے سو میں اس مچھلی کو بھول گیا۔ اور مجھکو شیطان ہی نے بھلا دیا، کہ میں اسکا ذکر کرتا اور اس مچھلی نے دریا میں عجیب طور پر راہ لی، موسیٰ نے فرمایا کہ یہی وہ موقعہ ہے جسکی ہمکو تلاش تھی، سو دونو اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے اُلٹے لوٹے، سو اُنھوں نے میرے بندوں میں سے ایک خاص بندہ کو پایا جن کو ہم نے اپنی خاص رحمت دی تھی، اور ہم نے ان کو اپنے پاس سے ایک خاص طور کا علم سکھایا تھا، موسیٰ نے اُن سے فرمایا کہ میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں، اس شرط سے کہ جو علم مفید آپ کو سکھلایا گیا ہے، اُسمیں سے آپ مجھکو بھی سکھلا دیں، ان بزرگ نے جواب دیا، آپ سے میرے ساتھ رہ کر صبر نہ ہوسکے گا، اور ایسے اُمور پر آپ کیسے صبر کرسکیں گے جو آپ کے احاطۂ واقفیت سے باہر ہیں، موسیٰ نے فرمایا آپ مجھکو انشاء اللہ صابر پائیں گے، اور میں کسی بات میں آپکے خلاف حکم نہ کرونگا، ان بزرگ نے فرمایا کہ اگر آپ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو مجھ سے کسی بات کی نسبت کچھ پوچھنا نہیں، جبتک کہ اس کے متعلق خود ہی ابتدا ذکر نہ کردوں"

"پھر دونوں چلے یہانتک کہ جب دونوں کشتی میں سوار ہوئے، تو ان بزرگ نے اس کشتی میں چھید کردیا موسیٰ نے فرمایا کہ کیا آپ نے اس کشتی میں اس لئے چھید کیا ہے کہ اسکے بیٹھنے والوں کو ..................

غرق کردیں آپ نے بڑی بھاری بات کی، ان بزرگ نے کہا کہ میں نے کہا نہیں تھا کہ آپ سے میرے ساتھ صبر نہ ہوسکیگا، موسیٰ نے فرمایا کہ آپ میری بھول چوک پر گرفت نہ کیجئے، اور میرے اس معاملہ میں مجھ پر زیادہ تنگی نہ ڈالئے، پھر دونوں چلے یہانتک کہ جب ایک لڑکے سے ملے تو ان بزرگ نے اسکو مار ڈالا، موسیٰ کہنے لگے کہ آپ نے ایک بے گناہ جان کو بے کسی جان کے بدلے مار ڈالا، بلاشبہ آپ نے بڑی بیجا حرکت کی، [illegible] نے فرمایا کہ کیا [illegible]

نہیں کہا تھا کہ آپ سے میرے ساتھ صبر نہ ہوسکے گا، موسیٰؑ نے فرمایا اگر اس مرتبہ کے بعد آپ سے کسی امر کے متعلق کچھ پوچھوں تو آپ مجھ کو اپنے ساتھ نہ رکھئے، بیشک آپ میری طرف سے عذر کو پہونچ چکے ہیں، پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب ایک گاؤں والوں پر گزر ہوا، تو وہاں کے باشندوں سے کھانے کو مانگا تو انھوں نے انکی مہمانی کرنے سے انکار کر دیا، اتنے میں ان کو وہاں ایک دیوار ملی جو گرا ہی چاہتی تھی، تو ان بزرگ نے اسکو سیدھا کر دیا، موسیٰؑ نے کہا کہ اگر آپ چاہتے تو اس پر کچھ اُجرت ہی لے لیتے، ان بزرگ نے کہا، کہ یہ وقت ہماری اور آپکی علیحدگی کا ہے، میں ان چیزوں کی حقیقت بتائے دیتا ہوں، جن پر آپ سے صبر نہ ہوسکے گا"

"وہ جو کشتی تھی سو وہ چند غریب آدمیوں کی تھی، جو دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے، سو میں نے چاہا کہ اس میں عیب ڈالدوں، اور ان لوگوں کے آگے کی طرف ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی پکڑ رہا تھا، اور رہا وہ لڑکا سو اُس کے ماں باپ ایماندار تھے، سو ہم کو اندیشہ ہوا کہ ان دونوں پر سرکشی اور کفر کا اثر نہ ڈالدے، پس ہمکو منظور ہوا کہ بجائے اس کے انکا پروردگار ان کو ایسی اولاد دے، جو پاکیزگی میں اس سے بہتر ہو، اور محبت کرنے میں اس سے بڑھکر ہو، اور رہی دیوار، سو وہ دو یتیم لڑکوں کی تھی جو اس شہر میں ہیں اور اس دیوار کے نیچے اُن کا کچھ مال مدفون تھا، اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا، سو آپ کے رب نے اپنی مہربانی سے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کو پہونچ جاویں اور اپنا دفینہ نکال لیں اور کوئی کام میں نے اپنی رائے سے نہیں کیا، یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن پر آپ سے صبر نہ ہوسکا"

بخاری کے اندر کتاب التفسیر میں تفصیل کے ساتھ قرآن کے اس واقعہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، چونکہ حدیث میں چند باتوں کے سوا وہی باتیں مذکور ہیں جو قرآن میں ہیں، اس لئے اعادہ کی ضرورت نہیں، ہاں بعض وہ باتیں لکھدینا ضروری ہیں جن سے قرآن کے بعض اجمال کی تفصیل ہوتی ہے، مثلاً قرآن مجید میں خضر کا نام نہیں، صرف "عبداً من عبادنا" (میرے بندوں میں سے ایک بندہ) کہا گیا ہے، حدیث نے بتایا کہ یہ خضر تھے،

عن سعید ابن جبیر قال لابن عباس ان نوفا البکالی یزعم ان موسیٰ بنی اسرائیل لیس بموسیٰ الخضر فقال کذب عدو الله حدثنا ابی ابن کعب عن رسول الله صلی الله علیہ وسلم قال قام موسیٰ خطیباً فی بنی اسرائیل، الخ

سعید ابن جبیر سے روایت ہے کہ انھوں نے ابن عباسؓ سے کہا کہ "نوف بکالی" کا خیال ہے کہ بنی اسرائیل کے موسیٰ وہ نہیں ہیں جو خضر کے موسیٰ تھے، حضرت ابن عباس نے جواب دیا کہ اللہ کے دشمن نے جھوٹ کہا ہم سے حضرت ابی ابن کعبؓ نے بیان کیا انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ نے فرمایا کہ موسیٰ بنی اسرائیل کو خطبہ دینے کیلئے کھڑے ہوئے (تا آخر حدیث)

اس کے بعد بیان کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ سے دریافت کیا کہ صفحۂ ارض پر سب سے زیادہ کون علیم ہے آپ نے کہا میں، اس پر خدا نے ان کو سفر کرنے کی ہدایت کی، اور خضر سے ملایا، جسکی تفصیل قرآن میں ہے، قرآن مجید میں صرف

عبدٌ من عبادنا ہے اور اس کے بعد اسکی ضمیر محذوف آئی ہے، لیکن حدیث میں مذکور ہے، کہ صاف طور پر آنحضرت نے "خضر" کا نام لیا ہے، مثلاً "قال لہ الخضر یاموسیٰ"۔ قرآن مجید میں کہیں "چشمۂ حیواں" کا تذکرہ نہیں، لیکن حدیث میں مروی ہے کہ موسیٰ کے خادم یوشع بن نون جنھیں انسائیکلوپیڈیا کا مقالہ نگار یونانی ضمیات کے حوالہ سے (Andreas) کا مبدل منہ بتاتا ہے، ایک چشمہ پر پہونچے تو یوشع بن نون کے ساتھ جو مچھلیاں تھیں ان پر پانی پڑا اور وہ زندہ ہوکر دریا میں روانہ ہوگئیں۔

قال وفی اصل الصخرۃ عین یقال لھا الحیاۃ لا یصیب من ماء بھا شیٔ الاحی فاصاب الحوت من ماء تلک العین قال فتحرک وانسل من المکتل فدخل البحر۔

(امام بخاری نے عبادہ کی حدیث معلقاً بیان کردی ہے، پوری حدیث حاکم نے نقل کی ہے) اُنھوں (عبادہ) نے کہا کہ اس چٹان کی جڑ میں ایک چشمہ تھا جسے لوگ "حیات" کہتے تھے، جس شے پر اس کا پانی پڑجاتا وہ زندہ ہوجاتی، پس اس چشمہ کا پانی ان مچھلیوں پر پڑگیا، اُنھوں نے کہا پس وہ حرکت کرنے لگیں اور جھولی سے کود کر دریا میں چلی گئیں،

قرآن مجید میں صرف مچھلی کے چلے جانے کا تذکرہ ہے۔

فلما بلغ مجمع بینھما نسیا حوتھما فاتخذ سبیلہ فی البحر سربا۔

جب دونوں دریاؤں کے جمع ہونے کے موقع پر پہونچے اس اپنی مچھلی کو دونوں بھول گئے، اور مچھلی نے دریا میں اپنی راہ لی،

ان واقعات کے مقابلہ میں "انسائیکلوپیڈیا آف رلیجن اینڈ اتھکس" کے ایک مقالہ کا حسب ذیل ترجمہ قابل غور ہے۔

"خضر" (سبز آدمی) ایک مسلمان ولی کا نام یا لقب ہے جو اہل اسلام کے عام خیال کے مطابق ہنوز زندہ ہیں، باوجود چند مساعی کے بھی یہ مسئلہ حل نہ ہوسکا کہ اس نام کی ابتدا کہاں سے ہوئی، لفظ خضر کی ابتدا جس طرح بھی ہوئی ہو، لیکن یہ قطعی امر ہے، کہ خضر کی ہستی کے متعلق (جیسا خیال اسلام میں پایا جاتا ہے) کوئی واحد مخصوص ماخذ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک مجموعہ ہے ان اوہام اور اساطیر کا، جو مختلف صورتوں میں ان ممالک اسلامیہ کے اندر مشہور تھے جن پر بعد میں مسلمانوں نے قبضہ کیا۔"

"یہ صحیح طور پر کہا جاتا ہے، کہ خضر (Mohammadan Syncretism)[لے] کی پیداوار ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ خضر کا تمامتر وجود، باوجود اس کے کہ وہ جماعات اسلامیہ میں ایک معروف حیثیت رکھتے ہیں، محض غیر اسلامی عناصر پر مبنی ہے، اسلام کو اس سے یہی تعلق ہے کہ ان تمام متضاد روایات کو ایک بوط

لے (Syncretism) کہتے ہیں ان افکار، عقائد کی عجیب تاویل اور تطبیق کو یا ان مختلف جماعات کی یگانگت ثابت کرنے کو جو باہم متنازع ہیں۔

واقعہ کی صورت میں مرتب کر لیا گیا ہے، یہاں پر افسانہ خضر کے پیچیدہ مسئلہ پر بحث کرنا ناممکن ہے، ہم لوگ مختصر طور پر ان ماخذ کا تذکرہ کریں گے، جہاں جہاں سے یہ فسانہ لیا گیا"

"عام طور سے اسلامی ادبیات اور بے شمار فارسی اشعار میں خضر کے متعلق اعتراف کیا گیا ہے، کہ انھوں نے آب حیات نوش کر کے غیر فانی زندگی حاصل کر لی، ایک قدیم اسلامی مورخ کے قطعی فیصلہ کے مطابق "خضر" ذوالقرنین (جو شامی عربی اصطلاح میں اسکندر اعظم کا خطاب ہے[1]) کے وزیر تھے، جنھوں نے چشمہ حیواں کا پتہ لگا لیا، جسے انکے ولی نعمت نہ پا سکے، یہ واقعہ بلا ریب ہم لوگوں کی توجہ "چشمہ حیواں" کے اس قصہ کی طرف مبذول کراتا ہے، جو کہ "فسانہ سکندر یونانی" میں پایا جاتا ہے، اور جو ........ (Pseudo callis thenes) کے نام سے شروع ہوتا ہے، یہ کتاب ۳۰۰ء میں ختم ہوئی اس روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ "اسکندر ابدی زندگی حاصل کرنے کی امید میں چشمہ حیوان کی تلاش کے لئے نکلا اتفاقاً اسکے باورچی کو (جو بعض روایات میں (Andreas) کے نام سے مشہور ہے) یہ چشمہ مل گیا وہ ایک نمک آلود یا خشک مچھلی چشمہ میں دھو رہا تھا کہ یکایک مچھلی میں جان آگئی، اور وہ پانی میں غائب ہوگئی باورچی نے چشمہ سے پانی نوش کیا اور حیات سرمدی حاصل کر لی، اسکندر نے جب پھر چشمۂ حیواں کا پتہ نہ پایا اسکا حسد اور یاس میں باورچی کو مار ڈالنے کا فیصلہ کیا، لیکن چونکہ وہ ایک غیر فانی زندگی حاصل کر چکا تھا، اسکندر نے اسکے گلے میں ایک بڑا پتھر لٹکا کر اسے دریا میں پھینک دیا، جہاں وہ ایک "بحری شیطان" (Sea-Demon) ہو گیا"

یہ قصہ جو ابتداءً ایک بیہودہ افسانہ کی حیثیت رکھتا تھا اس حیثیت سے شامیوں میں مشہور ہوا اور انکی وساطت سے عربوں میں مقبول ہوا، اس کا ایک پر تو قرآن میں پایا جاتا ہے، جس میں دوسرے ضمیاتی روایات کی طرح یہ بھی مرقوم ہے، اسلامی ماخذ سے پتہ چلتا ہے، کہ اسکندر کے باورچی جسنے نمک آلود مچھلی کے ذریعہ چشمہ حیوان کا پتہ لگایا "خضر" ہیں، ایک قیاس کے مطابق جسے چند علماء پیش کرتے ہیں (اور جو میرے نزدیک نامعقول ہے) "خضر" اس بحری شیطان کا لقب ہے جس میں غریب باورچی کو تشکل کر دیا گیا تھا جبکہ اسے سمندر میں ڈالا گیا۔

---

[1] یہ غلط "شامی عربی" اصطلاح ہے، ذوالقرنین سکندر بن فیلقوس یونانی کا لقب نہیں نہ قرآن میں وہ مراد ہے، بلکہ اس سے ایک یمنی سلطان مراد ہے، جو اپنے تاج میں [illegible] لگایا کرتا تھا، پیشانی پر اگر ہلال کی شکل بنائیں تو معلوم ہوگا کہ دو سینگ ایک اپنی جانب اور دوسری بائیں جانب ہے "دی سپرٹ آف اسلام" میں طویل بحث ہے۔

[illegible] حاشیہ میں لکھتا ہے کہ "چشمہ حیواں" کا قصہ (GLAUKES) ضمیات سے بھی ایک دلچسپ مماثلت رکھتا ہے، یہ مسئلہ پیش کیا جاتا ہے [illegible] (یقین) [illegible]، کہ "خضر" اور (TLAUKOS) جو ہم معنی الفاظ میں وجود کے اعتبار سے بھی ایک ہی حیثیت رکھتے ہوں بعض لوگوں نے خضر کو (HASISATRA) کی تحریف قرار دیا ہے جو گلگمیش (بابلی ضمیات کے ہیرو) کا مورث اعلیٰ تھا اور جسکے واقعات بابلی ضمیات میں ملتے ہیں۔

خضر کی دوسری تعیین پیغمبر ایلیاہ (ELIJAH) کی شخصیت میں کیجاتی ہے، یہودیوں کے عقیدہ کے مطابق ایلیا (ELIJAH) کے فرائض میں یہ داخل ہے، کہ وہ یہودیوں کی ہر تقریب میں حاضر رہتے ہیں۔ بہ شرطیکہ شراب کا ایک پیالہ اُنکے لئے بھی الگ رکھدیا جائے، (ELIJAH) کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ علما اور فضلا پر وحی کرتے ہیں، اور اُن کے قلوب میں انوارالٰہیہ ودیعت کرتے ہیں۔ اور یہودی قانون کے مختلف مسائل کا علم عطا کرتے ہیں، خصوصیت کے ساتھ ان سے راہ اور ویرانہ میں ملاقات ہوتی ہے، عہد آخری کے یہودی صوفیہ (KABBALISTS) "الہامِ ایلیا" (REVELATION OF ELIJAH) کا عام عقیدہ رکھتے تھے، اور انمیں بہتیرے افراد کا، دعوی ہے کہ اُنکے صوفیانہ خیالات بلکہ اُنکی پوری کتاب اس پیغمبر کی ذاتی رفاقت کا نتیجہ ہے۔

اس قسم کا ایک قصہ جسے گیارھویں صدی میں ایک یہودی مصنف نے لکھا ہے۔ (لیکن جوکہ بلاشبہ بہت قدیم عہد کی چیز ہے) یہاں پر لکھدینا مناسب ہے، اس قصہ میں بیان کیا گیا ہے، کہ ایلیا (ELIJAH) تیسری صدی کے ایک "ربی" (RABBI) کے ساتھ ہو لیتے ہیں اور وہ بہت سے ایسے حادثات دکھاتے ہیں جو بظاہر عدل خداوندی کے خلاف ہیں۔ لیکن جب پیغمبر "ایلیا" اسکی تشریح کرتے ہیں تو وہی حادثات حکمت اور عدل الٰہیہ کا ایک تعجب انگیز نمونہ ثابت ہوتے ہیں۔ یہ قصہ یا اس کے بعض ابتدائی اجزا نے قرآن میں داخلہ پایا "تلمود" کے "ربی" کی جگہ موسٰی نے لی اور ایلیا (ELIJAH) کی جگہ ایک مجہول اور بے نام شخص "میرے بندوں میں سے ایک بندہ" نے پائی۔

محمدؐ کے زمانہ میں یہودی عقیدہ مشہور تھا، چونکہ "ایلیا" کی طرح خضر کی خاص صفت انکی ابدی زندگی ہے، اسلئے ان دونوں ہستیوں کو ایک قرار دینا بالکل تقاضائے فطرت تھا پس اسلامی علما اور فقہا حیرت انگیز طور سے متفق الرائے ہو کر ظاہر کرتے ہیں کہ "بندہ" سے جسکا تذکرہ قرآن میں ہے "خضر" کے سوا کوئی دوسری ہستی مراد نہیں"

یہ دو ضیاتی افکار یعنی "چشمہ حیوان" اور "فسانہ ایلیا" جو ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ چیز اور مختلف ذہن اور مختلف ممالک کی پیداوار تھے، ایک مصنوعی اور پیچیدہ طریقہ سے قرآن کے اندر ایک ہی واقعہ کی صورت میں بیان کردئے گئے اور صرف یہی نہیں کہ اسلامی علمائے دین قرآن کے اس بیان کردہ واقعہ کو ایک واحد مسلسل حقیقت تصور کرتے ہیں۔ بلکہ ان معلومات کا علم ہوتے ہوئے بھی "جو حقیقت پس پردہ" کا درجہ رکھتے ہیں مغربی علما بھی واقعہ کی یگانگت اور دو مختلف روایات کا واحد مسلسل واقعہ ہونا تسلیم کرتے ہیں۔

ان دو واقعات کی مخلوط صورت کا یہ اثر ہوا کہ قدیم لامذہب (PAGAN) قوموں میں خضر کے متعلق "بحری شیطان" جو عقیدہ تھا وہ مٹ گیا اسلام میں خضر کا تقدس کیا گیا اور بعض علمائے اسلام نے انھیں ولی اور پیغمبر، اور بعض نے فرشتہ ثابت کیا، مسلمان علمائے قصص و اساطیر نے خضر کو باورچی سے وزیر کے درجہ پر لا کھڑا کیا۔

اسمیں شک نہیں کہ مسلمان ابتداً (ELIJAH) اور خضر کی اساطیری قسم کی حیثیت میں کافی مماثلت پاتے تھے،

کیونکہ انکا خیال ہے کہ خضر کا اصلی نام ایلیا (ILY ،عہ) ہے جو یہودی (ELIJAH) کی تحریف ہے وہ یہودی جو اسلامی ممالک میں رہتے تھے ان دو اسماء کے باہمی تناسب معنوی کے قائل تھے، چونکہ جسکا نام (ELIJAH) ہوتا وہ خود کو "خضر" کہا کرتا، اور ترک آج بھی ہمارے پیغمبر کو "خضر لاس" (خضر الیاس، کہکر دونوں لفاظ کے ہم معنی ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

جو بات زیادہ اہم ہے، وہ یہ ہے، کہ "ایلیا" کی خصوصیات اور کمالات کو خضر کی طرف منسوب کیا جاتا ہے خضر کو ایلیا کی طرح ہر جگہ حاضر بتایا جاتا ہے، اور جب انکا نام لیا جاتا ہے، تو۔ حاضر ہوجاتے ہیں، وہ حاجت کے وقت ایک مددگار اور صلاح کار ہوتے ہیں، وہ انلوگوں سے ملتے ہیں جو ان کی رفاقت کے لائق ہوتے ہیں اور علم اسرار الٰہیہ سکھاتے ہیں، ایک حدیث کے مطابق وہ آنحضرت کی وفات کے بعد آپ کے صحابہ کی تسلی کے لئے ظاہر ہوتے ہیں۔

یہودیوں کے (KABBALISTS) کی طرح صوفیائے اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ خضر کی رفاقت کا شرف حاصل کرتے ہیں، بیشمار قصے مشہور ہیں کہ کس طرح خضر نے خاص خاص صوفیائے کرام کو اپنی تعلیم و تربیت سے مستفیض کیا اور عبادت و ریاضت کے طریقے بتائے، اور بہتیری کتابوں کے متعلق انکے مصنفین کا دعویٰ ہے کہ وہ خضر کی بلا واسطہ تعلیم کا نتیجہ ہیں خضر اور ایلیا کے قصوں میں اور بھی قریبی مماثلت یوں پائی جاتی ہے، کہ جسطرح تصنیفات میں ایلیا کو (PHINEHAS) سے تعبیر کیا گیا ہے اسی طرح اسلامی تصنیفات میں خضر کا بھی حال ہے، اور جس طرح مسلمان قصہ نگاروں کی کتاب میں خضر کو ایک بدوی کے بھیس میں پیش کیا جاتا ہے، اسی طرح "تلمود" میں ایلیا کے متعلق بھی واقعات ملتے ہیں اور بھی اس قسم کی بہتیری مثالیں ہیں، جن سے دونوں واقعات کے تمثل اور ...... یگانگت پر کافی روشنی پڑتی ہے،

اس وجہ سے کہ قرآن کے اندر ایلیا کا نام یونانی شامی زبان میں الیاس وارد ہوا ہے اور الیاس کا واقعہ (POSHBIBCHICAL) سے زیادہ بائبلی رنگ میں پایا جاتا ہے، علمائے اسلام مجبور ہوئے کہ "خضر ایلیا" اور الیاس کو دو ہستیاں تصور کریں، الیاس اور خضر کا ابتدائی کارنامہ اس عقیدہ سے ثابت ہوجاتا ہے کہ جو مسلمانوں میں مسلم ہے، اور جس کی وضاحت قصص کی بے شمار روایات سے ہوتی ہے، چونکہ دونوں پیغمبروں پہ مسافروں کو انکے سفر میں مدد کرنیکی ذمہ داری ہے، اس لئے "ایلیا" مکلف فی البر" (خشکی پر متعین ہیں اور ...... خضر "مکلف فی البحر" (تری میں مدد کرتے ہیں۔

اسمیں شک نہیں مفتوح قومیں اسلام کے اندر اپنی بعض تعلیم بھی ساتھ لائیں اس صورت سے اسلامی ممالک محروسہ میں "خضر" مختلف عقائد داوہام کا مرکز قرار پا گیا، جہانتک ملک شام کا تعلق ہے "کرٹس" اور "سی کلر مونٹگینو"

کی تصنیفات سے خضر کے متعلق بعض اہم مسائل پر روشنی پڑتی ہے، چنانچہ کرٹس کا بیان ہے، کہ اس نے سواحل شام پر خضر کے نام سے بہتیرے معابد (SANCTUARIES) دیکھے جہاں پر آج انکے (خضر) کے نام پر قربانیاں چڑہائی جاتی ہیں، اور جانور کا پہلا بچہ قربان کیا جاتا ہے، چنانچہ کرٹس کا بیان ہے کہ اس سے ایک مسلمان نے کہا کہ "خضر نزدیک ہیں اور خدا دور ہے"، خضر کے ساتھ ایسی تعظیمی عقیدت (جسے عبادت سے تعبیر کرسکتے ہیں)، کا واقعہ دیکھکر کہا جاسکتا ہے کہ قدیم سامی عقائد آج تک متداول ہیں، خصوصیت کے ساتھ قدیم "بابلی تامز" تعلیم کی روح ہنوز باقی ہے،

اسلامی علمائے دین ہمیشہ اس افراط کے مخالف ہیں اُنھوں نے اس حدیث صحیح کے مطابق کہ "نبی صلعم کی وفات کے بعد خضر تشریف لائے" وجود خضر کو تو تسلیم کیا لیکن اُنھوں نے یہ بتایا کہ وہ آنحضرت کے معاصر تھے، اور آپ کی وفات کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد انتقال کر گئے، لیکن یہ تعلیم چونکہ صوفیہ کے "اوہام خضر" کے مخالف تھی، اسلئے کامیاب نہ ہوسکی۔

انسائیکلوپیڈیا کے مقالہ نگار کا اعتراض یہ ہے کہ خضر کے سلسلہ میں جو واقعات قرآن نے پیش کئے ہیں انھیں علم الاصنام کے دو مختلف واقعات کی صناعانہ رنگینی بیان سے تعبیر کرسکتے ہیں، حالانکہ ہر شخص باونیٰ تامل سمجھ سکتا ہے کہ قرآن مجید نے موسیٰ اور انکے خادم کے سلسلہ میں، مچھلی کا جو واقعہ بیان کیا ہے، اُسکا ماخذ یونانی ضمیات نہیں ہوسکتی، چونکہ یونانی علم الاصنام کی بنا پر "انڈریاز" کو آب حیوان پینے اور حیات جاوید حاصل کرنے پر اپنی ناکامی کے غضب میں اسکندر نے دریا میں ڈالدیا اور وہ ایک بحری شیطان ہوگیا، حالانکہ موسیٰ اور اُنکے خادم یوشع بن نون کے درمیان اس قسم کا کوئی واقعہ نہیں ہوا، صرف مچھلی کے غائب ہونے کے مسئلہ پر اگر قرآنی اور ضمیاتی (یونانی) واقعہ میں یکرنگی پائی جاتی ہے تو اس سے ہرگز یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا، کہ یونانی ضمیات قرآنی واقعہ کا ماخذ ہے، اگر قرآن نے یہ بیان کیا ہوتا کہ موسیٰ نے یوشع بن نون کو مچھلی کے غائب ہونیکے غصہ میں دریا کے اندر ڈالدیا، تو البتہ ایک وجہ مماثلت تھی، کیونکہ اسکندر اور انڈریاز کے افسانہ میں، اصل فسانہ "انڈریاز" کا "بحری شیطان" بننا ہے، نہ کہ مچھلی کا غائب ہوجانا اس لئے معلوم ہوا کہ قرآن نے موسیٰ اور یوشع کے جو واقعات بیان کئے ہیں انکو اسکندر اور انڈریاز کے افسانہ سے تعلق نہیں۔

البتہ اسرائیلی روایات سے مدد لیکر موسیٰ اور خضر کی مرافقت اور مکالمہ کے متعلق جو کچھ انسائیکلوپیڈیا کے مقالہ نگار نے لکھا ہے وہ ایک حد تک قرآن کے بیان کردہ واقعات سے ملتا ہوا ہے، اور اسمیں جرح بھی نہیں چونکہ بہت سے اسرائیلی واقعات قرآن میں پائے جاتے ہیں، البتہ مقالہ نگار نے اسرائیلی واقعہ کو (POST BIBLICAL) بتایا جاتا ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے علم الاصنام میں یہ واقعات ملتے ہیں انکا یہ کوئی مذہبی عقیدہ نہیں بہرحال دماغ انسانی کی عجوبہ نوازیاں ہر قدیم واقعہ کے ساتھ مل کر حقیقت پر پردہ ڈالدیتی ہیں اور اس لئے آیندہ نسلیں درایت کے لحاظ سے انھیں نامعتبر خیال کرکے

یکسر وہم و افسانہ کہدیتی ہیں" علم الاصنام والاوہام" (MYTHS OF LEGENDS) کے بہتیرے افسانے حقیقتوں کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں، خضر کا تعلق حقیقات سے ہے لیکن صنمیات نے ان پر اپنا گہرا اثر پیدا کردیا ہے، خضر کو اسلامی صنمیات کے درجہ پر پہونچانیوالے اور صوفی شعرا تھے، چنانچہ حضرت جامی حضرت احمد بن الحواری تیسری صدی کے ایک مشہور ولی کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

احمد بن السماک بیمار تھے (احمد بن الحواری فرماتے ہیں) میں ایک نصرانی طبیب کے یہاں انکا قارورہ لیکر چلا راستہ میں ایک خوبصورت آدمی ملے، جو عمدہ اور خوشبودار لباس پہنے ہوئے تھے، اُنھوں نے فرمایا کہاں جاتے ہو، میں نے کہا فلاں طبیب کے یہاں جاتا ہوں تاکہ ابن سماک کا قارورہ دکھاؤں، اُنھوں نے فرمایا، کہ سبحان اللہ خدا کے دوست کے علاج میں خدا کے دشمنوں سے مدد لیتے ہیں اس قارورہ کو زمین پر ٹپک دو، اور ابن سماک سے کہو کہ جہاں درد ہے، اپنا ہاتھ رکھکر کہے بالحق انزلناہ و بالحق نزل پھر ایسا غائب ہوگئے کہ میں نے نہ دیکھا پس ابن سماک کے پاس میں آیا اور واقعہ بیان کیا، اُنھوں نے درد کی جگہ پر اپنا ہاتھ رکھا اور جو کچھ اس آدمی نے سکھایا تھا کہا، اوسی وقت تندرست ہوگئے اور فرمایا "آں مرد خضر بود علیہ السلام"۔

اسی طرح ابوبکر کتانی (متوفی ۳۲۲ھ) کے سلسلہ میں افسانہ خضر کے بہت دلچسپ واقعات ملتے ہیں۔

"شیخ الاسلام گفت کہ وے صحبت دار خضر بود، وقتے خضر وے را گفت یا ابابکر ہمہ مرداں ازیں طائفہ مرا می شناسند ومن ایشاں را نمی شناسم، و لے گفت کہ خضر گفت کہ در مسجد صفا بودم بر این مردم بر عبدالرزاق حدیث می خواندند و در گوشہ مسجد جوانے بود سر در گریباں فرو بردہ، گفتم مردم بر...... عبدالرزاق حدیث می خوانند تو اینجا نشستہ چرا نمی روی دا زوے حدیث نشنوی گفت من اینجا از "رزاق" می شنوم تو مرا با عبدالرزاق می خوانی گفتم اگر راست می گوئی من کیم گفت خضر و سر در گریباں فرو برد"۔

یہ واقعات بالکل یہودیت سے ماخوذ ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی فقرا نے یہودی صوفیہ (KABBALISTS) کی ہمنوائی میں یہ ضعف اعتقاد پیدا کرلیا ہے کیونکہ یہ تخیلات انسائیکلوپیڈیا کی تصریحات کے مطابق، صوفیائے یہود میں مروج تھے۔

چونکہ ڈاکٹر نکلسن نے ثابت کردیا ہے کہ ارتقائے تصوف میں یہودیت نے بھی حصہ لیا ہے، اس لئے بہت ممکن ہے، خضر کی رہبری تعلیم وغیرہ کے متعلق جو کچھ صوفی ادبیات میں پایا جاتا ہے، وہ یہودیت سے ماخوذ ہو

فارسی زبان کے اکثر ابتدائی شعرا خود صوفی تھے، اس لئے اُنھوں نے علم الاصنام کے وہ تمام افسانے اپنی شاعری میں منتقل کرنا شروع کئے جنکا اسلام کی مذہبی ادبیات سے چنداں تعلق نہیں، چنانچہ خاقانی کہتے ہیں۔

کسے کیں خضر معنی راست دامنگیر چوں موسیٰ  کفِ موسیٰ و آبِ خضر بینی در گریبانش

خاقانی کی زندگی کے دو اہم پہلو تمام مورخین نے بیان کئے ہیں چنانچہ تذکرہ دولت شاہ اور نفحات الانس جامی میں آپکے روحانی تقدس اور باطنی اوصاف کا اعتراف کیا گیا ہے، مولانا جامی لکھتے ہیں:-

ہر چند وے شاگرد فلکی شاعر است و بہ شعر شہرت تمام یافتہ چنیں گویند کہ ویرا در اطوار شعر طور دیگر بودہ است کہ شعر در جنب آں کم بودہ (نفحات الانس)

اسی طرح صاحب صحف ابراہیم کا قول موازنہ عرفی و خاقانی (مطبوعہ نگار بابت دسمبر ۲۸ء) کے سلسلہ میں لکھا جا چکا جس سے آپکے ذوق صوفیانہ پر روشنی پڑتی ہے، لیکن خاقانی کی زندگی کا ایک تیسرا رُخ سید نور الدین بن سید شریف الحسینی، المرعشی الشوستری نے بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

طریقہ شیخ سنائی پیمودہ، نقش مذہب حق اہل بیت بر لوح اعتقادی نگاشت اما چوں در روزگار حکیم خاقانی حکیم اسلم الیان در جمیع مواطن جاری بود، و بلیہ تقیہ در طائفہ علیہ شیعہ مرتضویہ ساری لاجرم بعض از عقائد خود را، در قطعہ مشہور کہ مذکور خواہد شد، بہ طریق کنایت ادا نمودہ (مجالس المومنین قلمی نسخہ پٹنہ لائبریری)

مصنف نے اسی طرح خواجہ سلمان ساوجی کو بھی مذہب باطنیہ (شیعہ) کا متبع بنایا ہے، حالانکہ انھوں نے جس کلام سے استدلال کیا ہے اسکی مثالیں اکثر شعرائے فارس کے یہاں ملتی ہیں اور اگر سیاسی فضا کی بنا پر خاقانی کو "تقیہ" کی ضرورت پڑی تھی، جسکی اصلیت ایک دراز کار قیاس کے سوا کچھ نہیں تو اسی طرح تمام شعراء کو بھی شیعی عقائد کا پابند اور تقیہ پر عامل کہا جا سکتا ہے، خیر یہ تو ایک خارجی بحث تھی۔

خاقانی نے اپنے شعر میں تصوف کے ایک خاص عمل "مراقبہ و مکاشفہ" کی تفصیل کی ہے، چنانچہ اسی ضمن میں یہ شعر بھی لکھا ہے، جسکا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے موسیٰ کی طرح اس "خضر معنی" کا دامن پکڑا تو کف موسیٰ (معجزہ ید بیضا) اور چشمہ حیواں اسکے گریبان میں نظر آوے گا، خاقانی کے خیال کا ایک جزو تو قرآنی روایت پر مبنی ہے، اور دوسرا وہی علم الاصنام سے لیا گیا ہے، یعنی موسیٰ اور خضر کی مرافقت کا حال تو قرآن میں مذکور ہے، لیکن "آب خضر" تصوف کا وہ عقیدہ ہے جو ضمیات کا منت پذیر ہے،

خواجہ حافظ شیرازی فرماتے ہیں۔

حجاب ظلمت ازاں بست آب خضر کہ گشت ‏ ‏ ‏ زنظم حافظ و ایں طبع ہمچوں آب خجل

حافظ کہتے ہیں کہ میری طبیعت کے جوش و خروش اور نظم کی بلند پایگی نے چشمہ حیواں کو شرمندہ بنا دیا اس نے پردہ ظلمات میں اپنا منہ چھپا لیا یہ خیال تو سراپا علم الاصنام سے لیا گیا ہے،

حضرت خسرو دہلوی کہتے ہیں

آگہی کے دارد از اسکندر تشنہ جگر ‏ ‏ ‏ خضر تنہا خوارہ کو با آب حیواں خو گرفت

مطلب یہ ہے کہ جناب خضر تو اکیلے اکیلے آب حیواں نوش فرمانے کے عادی ہو گئے ہیں اور ایسے کہ پردہ ظلمات ہی میں نشیمن اختیار کر لیا اب انھیں کیا پڑی ہے کہ بیچارے تشنہ کام اسکندر کی خبر لیں،

یہ صوفیہ کا وہ عقیدہ ہے جو علم الاصنام سے تصوف میں آیا اور پھر فارسی شعرا نے مختلف پیرایہ میں بیان کیا۔

شیخ علی حزیں لاہجی فرماتے ہیں،

بخشید حیات تن اگر آب سکندر　　دل زندگی از چشمہ حیوان تو یابند

یعنی اگر آب حیات سے جسم زندہ ہوتا ہے تو محبوب کے چشمہ حیواں سے روح اور قلب کو حیات ملتی ہے،

اسی طرح ملا نورالدین ظہوری ترشیزی فرماتے ہیں۔

در حلق خضر گشتہ گرہ آب حسرتے　　دانستہ است مردنم از آرزوئے کیست

شعر کا مطلب یہ ہے کہ خضر نے آب حیات تو پی لیا لیکن وہ آب حسرت بن کر انکے حلق میں کھٹک رہا ہے، چونکہ کسی کی طلب و آرزو میں میرا مرنا دہ رشک سے دیکھ رہے ہیں، لیکن خود نہیں مر سکتے۔

دنیا جانتی ہے کہ خضر کو آب حیواں پلانیوالا قرآن نہیں بلکہ وہ علم الاصنام ہے، اس لئے جناب ظہوری کی روح قبر میں بھی یہ سن کر بےچین ہو جاوے گی کہ حضرت جس رقیب (خضر) کو کسی شاہد رعنا کی محبت میں اپنا شریک مرگ بنانا نہیں چاہتے اور یہ کہکر اپنے ہیجان رقابت کو تسکین دے رہے ہیں کہ وہ تو آب حیات پی کر اس دنیائے آب و گل میں مقید ہو گئے، وہ مدت ہوئی دنیا سے سفر کر کے استعلائے روحانی حاصل کر چکے، کیونکہ قرآن انھیں دنیائے مادی کا مقید نہیں بتاتا اب رہی وہ حدیث جس میں وفات نبی صلعم کے وقت انھیں زندہ بتایا گیا ہے، تو یہ اصول حدیث کے مطابق بہت کچھ محل نظر ہے، علاوہ ازیں بخاری میں میری نظر سے یہ حدیث نہیں گزری، انسائیکلوپیڈیا کے مقالہ نگار نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔

---

ناظرین کرام! میرا اس تمام کاوکاو خامہ فرسائی کی اصل غرض یہ ہے کہ ہمارے ارباب وطن جن میں ادبی ذوق کچھ نہ کچھ ضرور پایا جاتا ہے، قرآن مجید کی طرف اس ادبی نقطۂ نظر سے ضرور توجہ کریں، ہندوستان میں آج کثیر التعداد نوجوان لکھنے والے موجود ہیں وہ اپنے مضامین میں ہیوم اور اسپنسر، شکسپیر اور ملٹن، اسکر وائلڈ اور ہارڈی اور دوسرے مغربی ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں کے کلام اور نتائج فکر کے حوالے دیتے ہیں، لیکن انھیں دلچسپی نہیں ہے تو صرف قرآن مجید سے حالانکہ اس میں شعر و ادب کے محاسن، اقتصادیات و سیاسیات کے مسائل، اخلاق و تمدن کے قوانین، نفس و قیافہ کی باریکیاں موجود ہیں، الغرض ایک طرف قرآن میں مادہ کی کثافتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، تو دوسری طرف لطائف روحانیہ کے اجزا و تفصیلات معرض بحث میں لائے گئے ہیں امثال بالا سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ فارسی اور عربی شاعری کی تمام خصوصیات وہی سمجھ سکتا ہے، جو قرآن مجید سے باخبر ہو، اور اسوقت جبکہ اردو کی ارتقا میں عربی و فارسی سے لفظی و معنوی

ذخائر منتقل کئے جارہے ہیں تو کون کہہ سکتا ہے، ایک اُردو زبان کا ادیب صحیح معنی میں قرآن کے مطالب پر نظر رکھے بغیر ادیب لبیب کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔

ادبی جرائد وصحائف کا مطالعہ کرنیوالے حضرات، اگر صبح کے وقت نصف گھنٹہ یا پندرہ ہی منٹ قرآن مجید کی چند آیتیں با ترجمہ پڑھ لیں تو انکے ذوق ادبیہ کی ایک نئی زندگی ہو جاوے گی، مسلمان قرآن مجید پڑھتے ہیں تو صرف برکت سمجھ کر، حالانکہ برکت جس "اعجوبہ" کا نام ہے، وہ اس کے سوا دوسری بات نہیں کہ علم و معرفت میں ضیاء، اخلاق و تہذیب میں استواری، روح و جسم میں ایک تازگی پیدا ہو جائے، اور ہم جب تک دنیا میں رہیں، دنیا کی نظر میں باعزت رہیں، اور جب مریں ایک کیف اور روحانی نشاط کے ساتھ، مادہ اور روح کی انھیں وشت پیمائیوں میں بدرقہ راہ کا نام قرآن ہے اسلئے جب ہم فلاسفہ اور شعرا کے حوالے دینے لگیں، جب ہم گوئٹے کے تغزل اور ڈینٹ (DANTE) کے صوفیانہ خیالات پر روشنی ڈالیں، جب ہم روسی اور یوروپی افسانے لکھکر قلوب میں درد رقت یا عزم و ثبات کی خصوصیات پیدا کرنے کی کوشش کریں، تو خدارا قرآن کے اس عالمگیر (UNIVERSAL) پیام و دعوت کا بھی خیال رکھیں تبیان لکل شئ قرآن میں ہماری اس دنیائے آب و گل سے متعلق جتنی ضروریات ہیں سب پائی جاتی ہیں، اگر ایام نے مساعدت کی تو میں چھوٹے چھوٹے مضامین کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرونگا کہ ہم قرآن کے مطالعہ سے سیاسی اور ماہر اقتصادیات کیونکر بن سکتے ہیں؟ ہم اخلاق و معاشرت کا فلسفہ کیونکر حل کرسکتے ہیں، الغرض ہم روح اور مادہ کی کشمکش کے اندر دماغ انسانی میں پیدا ہونیوالے سوالات کا (جنھوں نے آج مختلف علوم کی صورت اختیار کرلی ہے) کیا جواب دے سکتے ہیں؟ کیا میں نوجوانان وطن سے ہم آہنگی کے ساتھ عمل پیرائی کی امید کرسکتا ہوں، بہرحال ؎

حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

عبدالمالک آروی

---

(نگار) ہمارے عزیز و فاضل دوست مولوی عبدالمالک صاحب کا مضمون ختم ہو گیا اور یقیناً اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اُنھوں نے اس کی ترتیب میں کافی کاوش وجستجو سے کام لیا اور نگار شکر گذار ہے کہ "بے منت دبے سوال و بے استحقاق" یہ مقالہ اُس کو مرحمت فرمایا گیا۔

اول اول جب اس مضمون کے ابتدائی اجزاء میرے پاس آئے اور عنوان کے لحاظ سے تمہیدی بحث کو میں نے دیکھا تو کچھ مضطرب سا ہوا اور میں نے فاضل مضمون نگار کو لکھا کہ "میں تمہید کو دیکھ کر کیوں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ آپ سے عنوان بدلنے کی درخواست کروں" یعنی ابتدائی گفتگو کیوں اُس مقصود سے دور ہے جو عنوان سے ظاہر کیا گیا ہے۔۔

اس کا جواب اُنھوں نے دیا جس کا مفہوم غالباً یہ تھا کہ ممکن ہے تمہید کی وسعت سے انتشار خیال کا شبہ پیدا ہو، لیکن آئندہ اجزاء مقصود سے بعید نہیں ہیں۔ لیکن میں نے اس مضمون کا تعارف کراتے ہوئے ملاحظات میں اپنا یہ خیال ظاہر کر دیا کہ "مجھے نہیں معلوم، اس بحث میں اُنھوں نے قرآن کی فصاحت و بلاغت سے بہ حیثیت معجزہ اعتنا کیا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو میں انھیں مشورہ دوں گا کہ اسی سلسلہ میں اس موضوع پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کریں"۔

یہ لکھنے کے بعد میں خاموش رہا اور میں نے بدستور "قرآن کے لطائف ادبیہ" کے عنوان سے اس مضمون کا سلسلہ جاری رکھا اور غور کرتا رہا کہ دیکھوں قرآن کے لطائف ادبی کون کون سے لکھے جاتے ہیں اور شعرائے عرب و فارس کا ان سے استفادہ کیا معنی رکھتا ہے؟

(اس مضمون کا پورا عنوان یہ تھا "قرآن مجید کے لطائف ادبی اور شعرائے عرب و فارس کا استفادہ")

لیکن اب کہ یہ مضمون ختم ہو چکا ہے اور میں اس کا تجزیہ کرنا چاہتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے لطائف ادبی کا ابھی تک اس میں ذکر نہیں آیا اور شعرائے عرب و عجم کے استفادہ کی جو صورت فاضل مقالہ نگار نے بتائی ہے، اس کے لحاظ سے اسکا عنوان زیادہ سے زیادہ

"عرب و عجم کی شاعری میں تلمیحات قرآنی"

ہونا چاہیئے تھا، اور یقیناً اس عنوان کے لحاظ سے یہ مضمون بہت زیادہ قابل ستائش ہے۔

اس مضمون کے حصۂ اول میں مولوی عبدالمالک صاحب نے عربی شاعری کے تین دور، اور نفس شاعری کے اثر و تاثر سے بحث کی ہے، اور اس کی خوبی سے انکار نہیں ہو سکتا۔ دوسرے حصہ میں میکڈانلڈ کے خیالات پر تنقید کرتے ہوئے کہانت کے انداز سے قرآن کے اسلوب بیان کو متمائز کرنے کی سعی کرتے ہوئے، وحی پیغمبرانہ اور الہام شاعرانہ کے فرق کو بیان کیا ہے، اور اس میں کلام نہیں کہ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے جو کچھ اُنھوں نے لکھا ہے خوب لکھا ہے اور ممکن ہے کہ مولویوں کی اصطلاح میں ان کو اس کی جزائے خیر بھی ملے، لیکن افسوس ہے کہ وہ استدلال کے لحاظ سے نہ میکڈانلڈ کو ساکت کرنے والا ہے نہ کسی اور غیر مسلم کو۔ ضرورت تھی کہ مختلف مثالیں دیکر قرآن کی ادبیت کو "انداز کہانت" سے بلند و برتر ثابت کیا جاتا، لیکن ایسا نہیں کیا گیا، کیونکہ ایسا نہیں کیا جا سکتا اور تا وقتیکہ کوئی شخص پہلے ہی سے قرآن پر ایمان نہ لے آئے، ان دونوں میں کوئی فرق و امتیاز محسوس نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس بحث میں ہمارے عبدالمالک صاحب کو آخر کار اسی فرسودہ منقولی حجت سے کام لینا پڑا جو ایک مولوی کا سب سے بڑا لیکن نہایت ہی ضعیف حربہ ہے۔

اس کے بعد اُنھوں نے عربی شاعری کی خصوصیات کا بالاختصار ذکر کرتے ہوئے اس کی عشقیہ شاعری سے گفتگو کی ہے، اور پھر قرآن نے جو اخلاقی رنگ اس میں پیدا کیا اس کا اظہار کیا ہے۔ ممکن ہے کہ مذہبیات میں اخلاقی شاعری

عشقیہ شاعری سے کوئی بلند مرتبہ کی چیز ہوگی، لیکن ادبیات کے سلسلہ میں مجھے اس کے ماننے میں تامل ہے۔

اس کے بعد "صور شعریہ" کے لحاظ سے قرآن کی بعض عبارتوں کو معیاری چیز ظاہر کیا ہے، حالانکہ اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا اور پھر شعرائے فارس کے کلام سے یہ ثابت کیا ہے کہ انھوں نے قرآنی قصص سے کتنی تلمیحات اپنے بیاں لیں اور اس سلسلہ میں انھوں نے موسیٰ، عیسیٰ، قارون، سلیمان، یوسف، اور خضر وغیرہ کے افسانوں سے متعلق بعض شعرائے فارس کا کلام مثالاً پیش کیا ہے۔

میں یہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور اب پھر اس کی تکرار کرتا ہوں کہ مولوی عبدالمالک صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کی خوبی سے انکار نہیں ہو سکتا اور نہ ان کی کاوش اور محنت کو کسی طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قرآن کے لطائف ادبیہ کا کہیں ذکر نہیں آیا جسے عنوان کا جزو اول قرار دیا گیا تھا اور نہ یہ ثابت کیا گیا کہ اگر شعرائے عرب و عجم نے تلمیحات قرآنی کو استعمال کیا تو اسے "استفادہ" کیوں کہا جائے، جبکہ محض ان تلمیحات کی وجہ سے رتبۂ شاعری بلند نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔

اگر اسی سلسلہ میں، قرآن کی ادبیت کے متعلق کوئی گفتگو کروں تو غالباً بے محل نہ ہوگا۔ عام طور پر مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ کلام مجید اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے بھی معجزہ ہے، اور ہر چند یہ خیال مسلمانوں میں بہت بعد کو اُسوقت پیدا ہوا جب وہ اسلام کی تمام صحیح تعلیمات سے منحرف ہو کر محض رسم و رواج اور تفاخر بیجا میں مبتلا ہو گئے اور اسلام کی دوسری ہدایات کی طرح قرآن کی حقیقت سے بھی اعراض کر کے صرف اس کی فصاحت و بلاغت میں پھنس کر رہ گئے، لیکن چونکہ اب غلطی سے اس اعتقاد کو بھی داخل ایمان قرار دے لیا گیا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ مختصراً اس غلطی کی طرف بھی لوگوں کو متوجہ کیا جائے۔

تمام قرآن میں ایک جگہ بھی آپ کو ایسی آیت نہ ملے گی۔ جس میں فصاحت و بلاغت پر مخالفین سے معارضہ کیا گیا ہو، بلکہ میرے نزدیک اس کی تردید کی گئی ہے۔

اہل عرب ہر اُس کلام کو جس میں خوبصورت الفاظ، دلچسپ بندش، اور سلاست و لطافت پائی جاتی، شعر کہا کرتے تھے خواہ وہ نثر ہو یا نظم۔ اور چونکہ قرآن میں بھی ان کو وہی فصاحت و بلاغت نظر آتی تھی۔ جو دوسرے شعراء کے کلام میں پائی جاتی ہے، اس لئے وہ قرآن کو بھی شعر کہتے تھے۔ لیکن قرآن کے شعر و شاعری ہونے سے ہمیشہ انکار کیا گیا کیونکہ شعر کی بنیاد محض سطحی و مادی جذبات پر ہوتی ہے اور قرآن کا مقصود صرف تربیت اخلاق و تزکیۂ نفس و روح تھا جو شعر و شاعری سے بہت بلند چیز ہے۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ قرآن نے کبھی اس کو پسند نہیں کیا کہ اس کی فصاحت و بلاغت کو اہمیت دے کر اس کے اصل مقصود کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹائی جائے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہٗ۔ ان ھو الا ذکر وقرآن مبین ۔

یعنی ہم نے رسول کو شاعری کی تعلیم نہیں دی اور نہ شاعری اس کے شایان شان ہے قرآن تو صرف نصیحت ہے اور کھلی ہوئی پند و وعظ کی کتاب۔

دوسری جگہ اس سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ نسبت شعری سے یوں انکار کیا گیا ہے:۔

والشعراء یتبعھم الغاؤن ۔ الم تر انھم فی کل واد یھیمون ۔

یعنی تم لوگ جو رسول کو شاعر کہتے ہو تو یہ نہیں سمجھتے کہ شاعروں کی تو ایک گمراہ جماعت ہے جو وہم و خیال کی دُنیا میں بھٹکتی پھرتی ہے اور اسی قسم کے لوگ انکا اتباع کرتے ہیں۔

کفار عرب کا قرآن کو نہ صرف شاعری بلکہ خیالات پریشاں کا مجموعہ کہنا خود کلام مجید سے ثابت ہے:۔

بل قالوا اضغاث احلام بل افتراہ بل ھو شاعر

لیکن اس کا جواب قرآن کی طرف سے ہمیشہ یہی دیا گیا کہ

ما ھو بقول شاعر قلیلا ما تؤمنون ولا بقول کاھن قلیلا ما تذکرون

الغرض قرآن میں شاعرانہ فصاحت و بلاغت کو کسی جگہ اہمیت نہیں دی گئی، بلکہ ان لوگوں کی مخالفت کی گئی، جو اس کو خصوصیات شعری کے لحاظ سے دیکھتے تھے۔

وہ لوگ، جو قرآن کی فصاحت و بلاغت کو بھی معجزہ قرار دیتے ہیں۔ ایک دلیل یہ بھی پیش کرتے ہیں کہ کلام مجید میں متعدد بار کفار سے خطاب کیا گیا ہے کہ اگر ان کے امکان میں ہے تو ایک آدھ ہی سورۃ ایسی بنا کے لے آئیں۔ یعنی اُن کے نزدیک ایسا کہنا گویا فصاحت و بلاغت کے نقطۂ نظر سے ہے۔ لیکن مجھے اس سے اختلاف ہے۔

منجملہ ان آیات کے جن میں قرآن کا مثل پیش کرنے کا معارضہ کیا گیا ہے۔ چند یہ ہیں:۔

(۱) ان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شھداءکم من دون اللہ ان کنتم صادقین

(اگر تمہیں قرآن کی صداقت کی طرف سے شک ہے تو ایک ہی سورۃ ایسی بنا لاؤ اور اپنے حمایتیوں کو بھی شریک کر لو اگر تم سچے ہو۔)

(۲) ام یقولون افتراہ ۔ قل فاتوا بعشر سور مثلہ مفتریٰت وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صادقین۔

(اچھا اگر تم یہ کہتے ہو کہ قرآن من گھڑت چیز ہے تو دس سورتیں ایسی ہی گڑھی ہوئی تم بھی لے آؤ اور جس سے جی چاہے اس کام میں مدد لیلو)

(۳) قل لئن اجتمعت الانس والجن علیٰ ان یاتوا بمثل ہٰذ القرآن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا۔

(اگر تمام انس وجن جمع ہو جائیں کہ قرآن کا مثل بنا سکیں تو ان سے ممکن نہ ہوگا)

(۴) ام یقولون تقولہ بل لا یومنون۔ فلیاتوا بحدیث مثلہ ان کانوا صادقین

(کیا لوگ کہتے ہیں کہ رسول نے اسکو خود گڑھا ہے، اچھا تو ان سے کہو کہ کوئی ایک ہی بات اسکی سی بنا لائیں اگر سچے ہیں)

ان تمام آیات کے دیکھنے کے بعد کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان میں کفار عرب کو فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے چیلنج دیا گیا تھا۔ اگر کوئی ایسا دعوےٰ کرتا ہے تو میرے نزدیک وہ غلطی پر ہے کیونکہ خود ان آیات پر غور کرنے سے اس کی تردید ہوتی ہے، پہلی، دوسری اور چوتھی آیت میں چیلنج دینے کی صورت یہ ہے کہ

"اگر تم کو قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں شک ہے یا تم اسکو من گھڑت چیز جانتے ہو"

تو اس کا جواب پیش کرو۔ اس انداز بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کفار عرب اسے انسانی کلام سے زیادہ نہ سمجھتے تھے اور اس کی فصاحت و بلاغت کا کوئی سکہ ان کے قلب پر ایسا نہ جما تھا کہ وہ اسے کلام انسانی سے زیادہ کچھ اور سمجھتے، چنانچہ وہ یہی کہا کرتے تھے کہ اس میں ہے کیا۔ لو نشاء لقلنا مثل ہٰذا۔ ان ہٰذا الا اساطیر الاولین (سورہ انفال آیت ۸)

خدا نے ان کے اسی اعتراض کا جواب یہ دیا کہ جس نقطۂ نظر سے تم کلام مجید کو دیکھ رہے ہو وہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ فصاحت و بلاغت یا شاعرانہ انداز بیان قرآن کا مقصود نہیں ہے۔ جو چیز دیکھنے کی ہے وہ اس کا ہادیانہ و مرشدانہ پہلو ہے، اور اسی خصوصیت کے لحاظ سے چیلنج دیا جاتا ہے کہ اگر کسی کے امکان میں ہو تو ایسی جامع کتاب ہدایت، ایسی مکمل شریعت، اخلاق ایسا پاکیزہ قانون تمدن اور ایسا کامل نظام جامعۂ انسانیت، پیش کرکے دکھاؤ۔

اگر فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معارضہ ہوتا تو تمام جن وانس سے خطاب کرنے کی ضرورت نہ تھی جیسا کہ آیت نمبر ۳، مندرجۂ بالا میں کیا گیا ہے۔ صرف یہ کہا جاتا کہ اگر دنیا کے تمام شعراء یا خطیب جمع ہو جائیں تو قرآن کا مثل پیدا نہیں کر سکتے۔

قرآن عربی زبان میں نازل ہوا جو اسوقت تمام اہل عرب کی زبان تھی اور اس میں وہی الفاظ، وہی اسلوب بیان اور وہی ترکیبیں استعمال کی گئیں جو اسوقت عام طور پر رائج تھیں۔ اس لئے یہ دعوےٰ کرنا کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت معجزہ ہے اور اس کا مثل پیش نہیں کیا جا سکتا درست نہیں۔ کیونکہ جس طرح کلام مجید کے متعلق یہ دعوےٰ کیا جا سکتا ہے اسی طرح دنیا کی اور کتابوں کے متعلق بھی یہی دعوےٰ ہو سکتا ہے۔ اگر قرآن کا فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے کوئی جواب نہیں ہو سکتا، تو مہلہل، امرؤالقیس، ابوالقاسم حریری کے کلام کا بھی جواب نہیں ہو سکتا۔ بلکہ استحالۂ مثل کا مسئلہ تو اس قدر صاف ہے کہ دنیا میں کسی چیز کا بھی مثل پیش نہیں ہو سکتا، جو چیز اپنی جگہ ہے، بے مثل ہے، اور وہ وہی رہے گی جو ہے۔

آج مسلمان خواہ کتنا ہی مضحکہ اڑائیں، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ مسیلمہ کا بنایا ہوا قرآن فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے کچھ کم تھا۔ کیا یہ اس کی سحر بیانی و فصاحت و بلاغت نہ تھی کہ عین عہد سعادت میں سینکڑوں قبائل اس کے اعجاز بیان سے مسحور ہو کر رہ گئے تھے۔ پھر اگر محض شاعرانہ اعجاز بیان ہی قرآن کا دعوےٰ ہوتا تو وہ بھی آج مسیلمہ کذاب کے قرآن کی طرح فنا ہو گیا ہوتا، اگر آج مسیلمہ کے ماننے والے دنیا میں نہیں ہیں، تو اس کا سبب یہی ہے کہ ہاں صرف اعجاز فصاحت و بلاغت تھا اور اگر آج قرآن کے ماننے والے کروروں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں تو اُس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اُس کا معجزہ صرف اُس کی اخلاقی تعلیم تھی۔

رسول بار بار شعر و شاعری سے اپنے آپ کو علحدہ بتاتا ہے، شاعروں کی برائی کرتا ہے، کہیں ایک جگہ بھی فصاحت و بلاغت کا ذکر نہیں آتا۔ اور قرآن کی خصوصیت وہ صرف ہدایت، ذکریٰ، قول حق اور بصائر ظاہر کرتا ہے، لیکن مسلمان کہتا ہے، "جی نہیں، یہ تو آپ کا صرف شاعرانہ انکسار ہے"۔ اور اس کی شاعری کی بھی داد دیتا ہے، حالانکہ اس طرح وہ ایسے اس درجہ پر کھینچ لے آتا ہے، جہاں سے اگر بآسانی اس کو نیچے گرایا نہیں جاسکتا، تو دوسروں کو ضرور وہاں تک پہونچایا جاسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عہد نبوی میں اور اس کے چند دن بعد تک، جب اسلام صحیح معنے میں ایک سادہ عملی مذہب تھا، کسی نے نہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کو معجزہ قرار دیا اور نہ اس لحاظ سے اس پر کوئی ایمان لایا، وہ اس کی دلنشیں تعلیمات کو پڑھتے تھے اور اس کے گرویدہ ہو ہو کر مصروف سعی و اقدام ہو جاتے تھے۔ لیکن بعد کو جب فتوحات اسلامی وسیع ہوئیں، مختلف ممالک کے لوگوں سے مل کر خیالات میں تبادلہ ہوا، امن و سکون سے بیٹھنے کے بعد فضول خیال آرائیوں کا موقعہ ملا، اور وہ قوت عمل مضمحل ہو گئی جس نے ان کو "اعلون فی الارض" بنا دیا تھا، تو وہ مباحث شروع ہو گئے جو دنیائے الہام سے فروتر، صرف دنیائے ایجاد و اختراع اور عالم حجت و تاویل سے متعلق تھے۔ چونکہ خود ان کی عملی زندگی مفقود ہو چکی تھی اور اس کے پیش کرنے کی کوئی صورت باقی نہ رہی تھی۔ اس لئے اب اسباب تفاخر و تفوق فراہم کرنے میں سوائے اسکے چارہ کار نہ تھا کہ وہ ہر اُس رطب و یابس کو لے لیں، جس کی علوم دنیاوی میں کبھی کمی نہیں ہوئی اور نہ ہوگی۔ اُنھوں نے قرآن کے مفہوم کو پس پشت ڈال کر صرف اس کے الفاظ کو لے لیا۔

جنت و دوزخ کی مادی تحقیق شروع کر دی، معاد و آخرت کا اسرائیلی مفہوم لینے لگے، صراط و میزان کے اساطیری معنے اختیار کئے، اور آخر کار یہاں تک سطح و قشر پر اتر آئے کہ قرآن کو شعر و شاعری سمجھ کر اس میں فصاحت و بلاغت کی جستجو کرنے لگے، زباندانی کے اُصول اس سے مستنبط کرنے لگے، علم معانی و بیان اور صرف و نحو کے قواعد کی بنیاد اس پر قائم ہونے لگی۔ پھر قرآن سے یہ دوری و استبعاد، اسلام سے یہ ہجر و فراق امتداد زمانہ کے ساتھ بڑھتا ہی رہا اور عہد عباسیہ تک آکر اس حد تک پس پشت ڈالدیا گیا کہ ہارون الرشید ایسا صاحب علم و فضل، حامل عقل و فراست بادشاہ بھی اپنی سلطنت کے بقا کے لئے قرآن کی آیات سے استفادہ نہیں کرتا، بلکہ فلکیات کے مطالعہ میں مصروف ہو جاتا ہے۔

اگر آج ساڑھے تیرہ سو سال کے بعد قرآن کا مصرف صرف یہ رہ گیا ہے کہ اُسے اطلس کے جزدان میں لپیٹ کر رکھدیا جائے، اور جب نکالا جائے تو اُس کو بوسہ دیکر اور ہاتھ کو اُس سے مس کرکے جسم پر پھیر لیا جائے، اس کے اوراق کی ہوا سے دفع مرض چاہا جائے، اُس کی آیتیں گھول گھول کر پلائی جائیں (کیونکہ ان کے نزدیک فیہ شفاء للناس شفاء امراض روحانی مراد نہیں ہے) اور گلے میں اُس کے لاکٹ بنا بنا کر ڈالے جائیں۔ تو حیرت نہ کرنا چاہیئے، کیونکہ خیالات کا جو انحطاط اب سے بارہ صدی قبل پیدا ہوا تھا۔ اس کو اسی حد تک آجانا چاہیئے تھا۔

ہمارے عزیز دوست مولوی عبدالمالک صاحب نے بھی اختتام مضمون پر یہ ہدایت کی ہے کہ مسلمانوں کو قرآن کا مطالعہ ادبی نقطۂ نظر سے کم از کم آدھ گھنٹہ روزانہ کر لینا چاہیئے۔ یہ نتیجہ ہے اسی ذہنیت کا جو مسلمانوں میں عرصہ سے پیدا ہو گئی ہے کہ قرآن میں سب کچھ موجود ہے، یہاں تک کہ اس میں شاعرانہ فصاحت و بلاغت اور لطائف ادبی بھی معجزہ کی حد تک پائے جاتے ہیں۔

خضر کے متعلق جو اظہار خیال اُنھوں نے کیا ہے وہ اسی طرح ایک مستقل مضمون کا محتاج ہے، جس طرح اور اسرائیلی قصص جو کلام مجید میں پائے جاتے ہیں۔ عبدالمالک صاحب نے کسی جگہ فٹ نوٹ میں ظاہر کیا ہے کہ یہ مبحث خاص انکے ذوق کی چیز ہے، اس لئے میں بہت ممنون ہوں گا اگر وہ ماخذ قرآن کے متعلق تمام ان اعتراضات کی طرف توجہ کریں جو اہل مغرب کی طرف سے عائد کئے جاتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ پہلے میں قلم اُٹھاؤں، کیوں نہ وہ خود اسکی ابتدا کریں اور مجھے صرف سمجھنے کے لئے آزاد چھوڑ دیں۔

اخیر میں مجھے پھر یہ عرض کرنا ہے کہ اس تحریر سے میرا مقصود صرف قرآن کے ادبی پہلو کے متعلق ایک اصولی گفتگو کرنا تھا۔ امید ہے کہ فاضل مضمون نگار اس کو کسی اور جذبہ پر محمول نہ کریں گے۔ کیونکہ میں ان کی تفتیش و تحقیق، ان کے ذوق علم و ادب کا معترف ہوں، اور اس وقت کا بےچینی کے ساتھ منتظر ہوں، جب میرے انکے درمیان مذہب کے افہام و تفہیم کے متعلق جو چند اصولی اختلافات ہیں دور ہو جائیں، اور مجھے ان کے سامنے دست ارادت پھیلانے میں تامل نہ ہو۔

نیاز

رسالہ چاہے نہ خریدیئے لیکن کم از کم اسکے مضامین کی فہرست تو دیکھ لیجئے

مارچ، اپریل، اور مئی کے پرچوں میں حسب ذیل مضامین شائع ہوئے ہیں۔ تنویم۔ غیر معمولی۔ تمثیل۔ بھوت۔ پریت۔ خواب کی دنیا مقناطیسیت اور تجسیم ہیجان۔ مسمرزم۔ حقیقت پس پردہ۔ روحانی تحقیقات کی تاریخ۔ مسئلہ تناسخ۔ کیا ہم مردوں سے باتیں کر سکتے ہیں؟ ایک رانی کی روح، مشاہدات و تجربات، اقتباسات۔ رسالانہ چندہ (عہ) ہے ششماہی خریداری کا قاعدہ نہیں ہے۔ "مینیجر نگار"

# شعلہ زارِ الفت

(۱)

خفیف سی دُھند رآمینی کے گرد و نواح کو گھیرے ہوئے تھی۔ پہاڑیوں کے پیچھے آفتاب غروب ہو رہا تھا اور اُس کی زرد اور مضمحل شعاعیں، جنکی حرارت تقریباً زائل ہو چکی تھی۔ درختوں کی ٹہنیوں پر پڑ رہی تھیں۔ فرانسیسکا، رامینی کے نواب کی بیوی، درختوں کی زردی کو تک رہی تھی۔ اُس کی نگاہوں سے بے خیالی ٹپک رہی تھی۔ اُس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ پرانے خیالات، غیر ارادی طور پر اُسکے دماغ میں گشت کر رہے ہیں۔ اُس کے بال اُس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے، جن سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ اُسکی نظریں باغ کی ٹہنیوں پر پڑیں، پھر روشوں پر، اور پھر نرگس کے کُنج پر چشمہ کے کنارے۔ اور بالآخر اُس کی نظریں زُہرہ کے مرمریں مجسمہ پر جم کر رہ گئیں جو چشمے کے وسط میں سنگ مرمر کے ایک خوبصورت چبوترے پر نصب تھا۔

"زُہرہ۔ اے میری مالکہ۔ میری دیوی، میں خدا کی نہیں تیری اور تیرے بیٹے کیوپڈ کی پرستار ہوں۔ پاؤلو نے مجھے تیرا غلام بنا دیا۔ پاؤلو کے عشق نے مجھے تیرا غلام بنا دیا۔ تیری وجہ سے پاؤلو میرا پرستار ہے۔ اور کیوپڈ کی وجہ سے میں پاؤلو کی پرستار ہوں۔ اے زُہرہ تو ہمیشہ اپنا سایہ میرے سر پہ قائم رکھ کہ پاؤلو مجھے چاہتا رہے۔ اور اے کیوپڈ تو اپنے چند اور شیریں تیر چلا کہ ہماری محبت ابدی محبت بن جائے"۔

ان الفاظ کو ادا کرتے وقت اُس نے سر اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا، اُسکے چہرے پر نورِ مسرت برس رہا تھا جس میں خشوع و خضوع کی جھلک تھی۔ ایک کیف کے عالم میں اُس نے آنکھیں بند کر لیں، اُس نے محسوس کیا کہ یونانی صنم پرستوں کی دیوی زُہرہ اُسکے سر پہ شفقت سے ہاتھ پھیر رہی ہے، اس لطیف تخیل سے اُسکی روح میں ایک لرزشِ مسرت طاری ہو گئی۔ اُس کے لبوں پر ایک لطیف تبسم پیدا ہو گیا۔

اُس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ تاریکی رفتہ رفتہ چھائی جا رہی تھی۔ درختوں کی ٹہنیاں سیاہی مائل نظر آ رہی تھیں۔ ایک غلام شمعیں روشن کر رہا تھا۔

معاً اُسے اپنے شوہر کا خیال آ گیا۔ اُس شخص کا جسکے ساتھ اُس نے اپنی زندگی کے سات سال گذارے تھے۔ جو ہمیشہ اُس سے محبت کرتا رہا۔ جس نے ہمیشہ اپنے قوی بازوؤں میں اُسے اُٹھا کر بچوں کی طرح اُسے بہلایا۔ اُس کا شوہر یوحنا، رامینی کا نواب۔ جو سات سال تک اُسکی اُلفت کا مرکز رہا۔ اور وہ خود بھی اپنے شوہر کی الفت کا مرکز بنی رہی۔

اور اب بھی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے اُس کے ضمیر نے اُسے ملامت کی کہ وہ اپنے خاوند کو دہوکا دے کر ایک دوسرے سے محبت کر رہی تھی۔ دفعتاً اُسکی نظر پھر زُہرہ کے مجسمے پر پڑی جو شیشے کے وسط میں ہاتھی دانت کی طرح چمک رہا تھا، اور اُس کے ساتھ ہی اُسے پاؤلو کا حسین چہرہ اور سچی روح یاد آ گئی۔

اُسے وہ شام یاد آ گئی جب وہ اپنے شوہر کے ساتھ کشتی پر بیٹھی چاندنی رات میں جھیل کی سیر کر رہی تھی، ایک اجنبی ساحل پر آیا اور ایک دوسری کشتی پر سوار ہو کر جھیل کی سیر کرنے لگا۔ ایک مرتبہ اُسکی کشتی بہت قریب سے ہو کر نکلی، اجنبی سے اُسکی نگاہیں ملیں، اور معلوم نہیں کیوں شرم اور شوق کی ایک ملی جلی لہر اُس کے قلب میں دوڑ گئی، اُس کے چہرے کا رنگ سُرخ ہو گیا، اور وہ اپنے شوہر سے باتیں کرنے لگی۔

پھر اُسے وہ دن یاد آ گیا جب اوسیڈ کے یہاں دعوت میں دوسری مرتبہ وہ اس اجنبی سے ملی، پہلی ملاقات اُسکے ذہن سے تقریباً رفع ہو چکی تھی۔ اوسیڈ نے اجنبی کا تعارف اُس سے اور اُس کے شوہر سے کرایا، اُس کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ پاؤلو —— یہی اجنبی کا نام تھا —— کے حرکات و سکنات میں ایک دلکشی سی ہے۔ دلکشی نہیں —— اُس کا قلب زیادہ سے زیادہ یہ اعتراف کر سکا کہ صرف دلچسپی۔

اجنبی —— اب وہ اجنبی نہیں پاؤلو تھا —— اُس کے شوہر سے بہت بے تکلف ہو گیا۔ اور کئی بار وہ اُن کے گھر آئینی بھی آیا۔ نواب پوجتا، اُسکو اپنا معتبر دوست سمجھنے لگا۔

پھر وہ دن اُس کی نظروں کے سامنے پھرنے لگے، جن میں پاؤلو سے اُسکی واقفیت بڑھتی گئی۔ پاؤلو کی اندرونی خوبیاں، اُسکی صداقتِ قلب، اُسکا گداز دل اُس پر رفتہ رفتہ ظاہر ہونے لگا۔ وہ یہ محسوس کرنے لگی کہ گویا اُس پر ایک سحر سا ہو رہا ہے۔ لیکن اس خیال کو اُس نے دل کی ایک کمزوری سمجھ کر نکال دیا۔

پھر اُسے وہ وقت یاد آ گیا، کہ جب شمعوں کی روشنی میں بیٹھا ہوا، پاؤلو کوئی گیت گا رہا تھا۔ شمع کی روشنی اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھی، اُس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے شمعوں کے اُجالے میں ہیروں کی طرح چمک رہے تھے۔ اُسکی آنکھوں میں ایک چمک تھی، جو رازِ محبت کی غمازی کر رہی تھی۔ یہ چمک جذبۂ محبت کی نہ تھی بلکہ ایک لطیف احساسِ الفت کی۔ اُسکی نظریں، پاؤلو کے چہرے پر پڑیں اور وہ شرما گئی، حجاب اور جھینپ سے اُس کا سر جھکانے لگا۔ اُس کا شوہر نواب پوجتا آج زردم گیا ہوا تھا۔ پہلا موقع تھا کہ وہ دونوں اکیلے تھے۔ اُس اضطراب اور جھینپ نے جو فرانسیسکا پر طاری تھی۔ پاؤلو پر بھی اثر کیا اُس نے نظریں جھکا لیں۔ کچھ دیر تک ایک خاموشی سی طاری رہی۔ فرانسیسکا نے اس ناگوار خاموشی کو محسوس کیا اور پاؤلو سے کچھ اور گانے کی فرمائش کی، پاؤلو اب تک اپنے اضطراب پر قابو نہ پا چکا تھا تاہم اُس نے سارنگی اُٹھائی اور ایک نہایت لطیف نغمۂ محبت گانا شروع کیا۔

پاؤلو بیخودی میں گاتا رہا۔ فرانسیسکا پر ایک حجاب آمیز اضطراب طاری ہو گیا۔ تاہم اُس کو موسیقی کے اثر کا

اپنے دل سے اعتراف کرنا ہی پڑا۔

فرانسیسکا کے چہرے پر شرم اور بے چینی کے اثر سے سرخی چھاگئی۔ اُس نے محسوس کیا کہ گویا وہ انگاروں پر بیٹھی ہے۔ اُس کا دل چاہا کہ وہ اُٹھ کر چلی جائے اور پھر کبھی اُس شخص سے نہ ملے، مگر وہ بیٹھی رہی۔ شاید اُس میں اُٹھ کے جانے کی طاقت نہ تھی۔ اس کے چہرے سے غصے، شرم، بے چینی اور تکلیف کا اظہار ہو رہا تھا۔ پاؤلو نے اُس کی طرف دیکھا، اور اپنی اس نغمہ سنجی پر جو محض اظہارِ الفت کا ایک ذریعہ تھا، اپنے دل میں ایک ملامت محسوس کی۔ اُسے کیا حق تھا کہ وہ ایک عورت کو جسے اپنے شوہر سے محبت تھی، جسکی ازدواجی زندگی مسرت سے لبریز تھی، اپنی محبت کی داستان سُناکر کشمکش اور تکلیف میں مبتلا کرے۔ بہتر تو یہی تھا کہ وہ اپنے اس جذبے کو اپنے دل ہی میں دفن کئے رہتا۔ یہاں سے کہیں اور چلا جاتا۔ اُس نے گھٹنے ٹیک کر فرانسیسکا سے معافی مانگی اور اس کا اقرار کیا کہ یہ اُس کے دل کی ایک بے جا لغزش ہے۔ اب کبھی وہ اس سے نہ ملے گا۔ اور اٹلی سے ہجرت کر کے قرطاجنہ یا مصر چلا جائے گا۔

فرانسیسکا کو اُس کا معافی مانگنا یاد آگیا۔ اُس کے چہرے پر ایک مظلومیت سی برس رہی تھی۔ جیسے کوئی گنہگار رحم کی التجا کر رہا ہو۔ اس کی مظلومیت کی ادا نے اُسے بے قابو کر دیا اور انجام سے بیخبر ہو کر اُس نے پاؤلو کے گلے میں باہیں ڈالدیں اور اُس کے لبوں پر محبت کے اقرار کا پہلا نشان ثبت کر دیا۔

فرانسیسکا کو وہ گھڑی یاد آگئی۔ جو اُس کی زندگی میں ایک انقلاب کی گھڑی تھی۔ جس نے اُسے ایک نئی زندگی ایک نئی لذت اور ایک نئے گناہ سے آشنا کیا۔

"میں رات کا کھانا نہ کھاؤں گی۔ پاؤلو کے سوا کسی اور سے نہ ملوں گی ...... تم جا کر سو جاؤ سنا آرلینڈر"

یہ الفاظ اُس نے اپنے حبشی غلام سے کہے جو شمعیں روشن کر رہا تھا۔ یوحنا آج بھی کسی شہر کو گیا ہوا تھا اور کل سہ پہر سے پیشتر اُس کے واپس آنے کی اُمید نہ تھی۔

## (۲)

باغ میں سنگ مرمر کی نشستگاہ پر پاؤلو اور فرانسیسکا دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ فرانسیسکا کا ایک ہاتھ پاؤلو کے گلے میں حمائل تھا۔ نرگس کا کنج ان دونوں کو چھپائے ہوئے تھا۔ رات کافی تاریک تھی۔

چشمے کا پانی چمک رہا تھا۔

وینس کا سفید بت دمک رہا تھا۔

دونوں محبت کی سرگوشیاں کر رہے تھے۔ میٹھی محبت بھری باتیں جو ہزاروں بار دہرائی جا چکی ہیں۔ دونوں گویا ایک بہشت خیال میں تھے۔ جہاں تک اس دنیا کی فکروں کی رسائی نہیں۔ پاؤلو جھکا اور فرانسیسکا کے نازک لبوں کو چوم لیا۔ نرگس کے کنج میں سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ رات کی تاریکی میں سیاہ لبادے میں

یوحنا کا پُرخشم چہرہ نظر آرہا تھا۔ اُسکی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ اُس نے ایک قدم ان دونوں کی طرف بڑھایا۔ اُسکے ہر ہر عضو سے عزم، استقلال، حوصلہ، اور بہادری کا اظہار ہو رہا تھا۔

"دونوں گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے دونوں کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا، شرم، ندامت، ذلت، بیوفائی کا احساس تلخ دونوں کو لرزا رہا تھا۔

"فرانسسیکا۔ بدبخت بے وفا عورت۔ تو جانتی ہے تیرا انجام کیا ہے"؛ نہایت خشمگیں آواز میں یوحنا نے یہ الفاظ ادا کئے اور ایک تیز خنجر تاریکی میں چمکتا ہوا نظر آیا۔

خوف کی ایک تیز لہر فرانسیسکا کے قلب کو دہلا گئی۔ وہ پاؤلو سے لپٹ گئی اور دونوں کے لب پیوستہ ہو گئے۔

ہوا میں خنجر دو مرتبہ چمکا اور دو لاشے زمین پر تڑپنے لگے۔

(۳)

تخئیل کے پر لگائے ہوئے، اطالیہ کا سب سے بڑا شاعر ڈانٹے، دوزخ کے دوسرے طبقہ میں داخل ہوا۔ عالمِ بالا کی سیر میں ورجل، اُس کا رہنما تھا۔

کلیوپٹرا ملی، وادیٔ نیل کی ملکہ، اور اپنا افسانۂ محبت سنایا۔

پھر ہیلین ملی، وہ لڑائی کی دیوی جس نے یونان اور ٹروجن میں سالہا سال تک خونریزی کرائی۔ اور اُس نے بھی اپنی محبت کی کہانی سُنائی۔

دوزخ کا دوسرا طبقہ گنہگار عاشقوں کے لئے مخصوص تھا۔ اور یہاں خاکدانِ ارضی کے شاعر نے بہت سے چاہنے والوں کو دیکھا۔

اسی شعلہ زارِ الفت میں فرانسیسکا بھی تھی۔ اور اس کا عاشق پاؤلو بھی۔

اور اُس نے بھی اپنا افسانۂ الفت ڈانٹے کو سُنایا۔

"میں نے پاؤلو کی محبت میں اپنے شوہر کو چھوڑا، خُدا کو چھوڑا، دنیا کو چھوڑا اور محبت صرف محبت کو اختیار کیا۔ شوہر نے مجھے قتل کیا۔ خدا نے مجھے دوزخ میں ڈلوا دیا۔ مگر محبت نے اب بھی مجھے نہیں چھوڑا۔ یہ شعلہ زار جہنم میرے لئے فردوسِ الفت ہے۔"

وہ آگ کے شعلوں میں لپٹی ہوئی کھڑی تھی، چاروں طرف آگ ہی آگ۔ جس کی حدت، اطالیہ کا شاعر اپنے تخئیل کے لبادے کے باوجود بھی محسوس کر رہا تھا۔

"یہ شعلہ زار جہنم ہمارے لئے فردوسِ الفت ہے"

یہ کہکر جہنم کے زہرہ گداز شعلوں میں فرانسیسکا نے پاؤلو کا بوسہ لیا۔ اور اطالوی شاعر نے ڈھیر کتے ہوئے

قلب سے دیکھا کہ جہنم کی آگ بھی، اُن کی محبت کے شعلوں کے سامنے ہیچ تھی۔ جس محبت کے شعلے اُن کو فنا کر چکے تھے۔ اُسی محبت نے اُنھیں حیاتِ جاودانی بھی عطا کی تھی۔

ڈانٹے کا سر چکرانے لگا۔ اور اگر ورجل اُس کا بازو پکڑ نہ لیتا تو شاید وہ رحم کے جذبے سے بیہوش ہو جاتا۔ دلوں میں محبت کا بیج بونیوالی ہستی نے شاعر کو حکم دیا کہ اس بدنام محبت کا راز آشکار اکرے بہت سے لوگ اس راز کو صحیح سمجھیں گے۔

اور بہت سے لوگ غلط۔

اور بہت کم رازِ محبت کو صرف راز ہی سمجھیں گے۔

عزیز احمد

# سودیشی ریل

(شوکت تھانوی کے ایک مضمون کا اقتباس کہیں کہیں سے)

ہمارے ایسے آدمی کے لئے سفر شروع کرنے کا یقین لوگوں کو اُسوقت ہوتا ہے جب ہم ٹکٹ خرید لیں۔ چنانچہ ہم نے بھی اپنی یہ عادت ڈال رکھی ہے کہ سفر شروع کرنے سے پہلے ٹکٹ ضرور خرید لیتے ہیں چنانچہ ہم کو جو سب سے پہلا مرحلہ اسٹیشن پہونچکر در پیش ہوتا ہے وہ بکنگ آفس کی کھڑکی میں جھانک کر ٹکٹ خریدنے کی درخواست پیش کرنا ہے۔ چنانچہ آج بھی ہم نے بالکل اسی پروگرام پر عمل کیا اور بکنگ آفس کی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر کہا:

"بابوجی! کانپور کا سکنڈ کلاس کا ٹکٹ دیدیجئے۔"

بابوجی نے بجائے اسکے کہ ٹکٹ دیدیتے پہلے تو ہم کو گھورا۔ پھر نہایت اطمینان سے فرمانے لگے:۔

"ایک بات کہدیں یا مول تول؟"

میں سمجھا بابوجی مذاق کر رہے ہیں۔ اور میں ہنس دیا۔ میرے ہنسنے پر بابوجی نے پھر کہا:۔

"جناب سنئے تین روپے ہوئے لائیے روپے اور ٹکٹ لے لیجئے۔" اب تو مجھے اور بھی زیادہ تعجب ہوا اور میں نے کہا "جناب تین روپے کیسے ہوئے ایک روپیہ تیرہ آنے تو کرایہ ہے، آپ کہتے ہیں تین روپے، مجھے کانپور کا ٹکٹ چاہیئے ہے۔ کانپور کا سکنڈ کلاس"۔

بابوجی نے ذرا ترش رو ہو کر جواب دیا "جناب والا میں بہرا نہیں ہوں۔ سن لیا ہے کہ آپ کو کانپور کا سکنڈ کلاس ٹکٹ چاہیئے ہے۔ مگر اسی کے تین روپے ہوئے۔ کوڑی کم نہ لوں گا جی چاہے لیجئے ورنہ جانے دیجئے"۔

میں۔ مگر بابو صاحب ابھی پرسوں تک تو ایک روپیہ تیرہ آنے کرایہ تھا آج کیا ہو گیا کہ ایکدم بڑھ گیا۔"

بابو "کل کی بات کل کے ساتھ۔ آج دیش ہمارا ہے۔ ہم کو سوراج مل گیا ہے"۔

میں۔ یہ کہیئے کہ سوراج ریل کو بھی ملا۔ اچھا خیر ٹکٹ دیجئے نہیں تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔

بابو۔ لائیے روپے۔ اچھا نہ آپ کی بات نہ ہماری بات ڈھائی روپے دیدیجئے۔ اور ٹکٹ لے لیجئے۔

بابو صاحب کی ان تمام باتوں پر کچھ تو ہنسی آرہی تھی اور کچھ غصہ آرہا تھا کہ فضول ان باتوں میں وقت ضائع ہو رہا ہے اگر گاڑی چھوٹ گئی تو مصیبت آگئی۔ ٹکٹ وکٹ سب دھرا رہ جائے گا۔ آخر کار میں نے طے کر لیا کہ میں بغیر ٹکٹ کے سفر کرونگا اور یہ سوچکر میں بکنگ آفس سے چلنے لگا مجھکو جاتا ہوا دیکھکر مجھکو بابو صاحب نے پھر آواز دی۔

(یہ مضمون مکمل اور متعدد اسی طرح کے دلچسپ مضامین "موجِ تبسم" میں درج ہیں جو زیرِ جلد میں شائع ہوئی ہے۔ حجم ۲۰۸ صفحات قیمت معہ محصول دو روپیہ) نوٹ۔ اگر کتاب پسند نہ ہو واپس کر کے دام لے لیجئے۔

مینجر۔ نگار۔ لکھنؤ

# کیا دُنیا کو مذہب کی ضرورت ہے؟

(بہ سلسلۂ سابق)

گزشتہ دو ماہ کی اشاعتوں میں بیان کیا جا چکا ہے کہ مذہب کی ابتدا دنیا میں کیونکر ہوئی، اور عہد حاضر میں اسکے ضعف و اضمحلال کے کیا اسباب ہیں؟ اس پر قیاس کرکے مستقبل کے لئے بہ آسانی یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ مذہب جو عملی طور پر اب بھی تقریباً فنا ہو چکا ہے، اقتصادی و ذہنی اعتبار سے بھی محو ہو جائے گا۔ اور ایک زمانہ آنیوالا ہے جب مذہب کی تعلیمات و اعتقادات کو اس نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ جس طرح آج "سکونِ زمین و حرکت افلاک" کے نظریۂ قدیم کو دیکھا جاتا ہے، یا جس طرح ایک ماہر آثار قدیمہ پُرانے کھنڈروں کو کھود کر بہت سے محو شدہ واقعات کو سامنے لاتا ہے۔

مذہب کو سب سے زیادہ صدمہ پہونچانے والے اسباب کیا ہیں اور کیا ہو سکتے ہیں، انکا تفصیلی ذکر ماہ گذشتہ کے نگار میں آچکا ہے، لیکن مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ دنیا کا ہر وہ قدم جو علم و حکمت کی طرف بڑھتا ہے، مذہب کو سو قدم پیچھے ہٹا دیتا ہے اور بدقسمتی سے مذہب کے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے جو انکا مقابلہ کرکے اپنی ہستی کو قائم رکھ سکے۔

علوم و فنون کے سلسلہ میں سب سے بڑا صدمہ مذہب کو جس چیز سے پہونچا وہ "قانونِ ارتقاء" کی تحقیق تھی، اس نے نہ صرف مذہب کے بہت سے مسلمات تاریخی کو پارہ پارہ کرکے رکھدیا، بلکہ خود مذہب کے اندر اسی اصول ارتقاء کے ماتحت تغیر و تبدل کا ہونا فطری اقتضاء قرار پایا۔ اور جو لوگ قدامت پرستی کو اصل مذہب سمجھتے تھے، خود ان کے ایمان متزلزل ہو گئے اور انھوں نے بھی اس اُصول کی صداقت مانکر مذہبی معتقدات میں تغیر و تبدل کو گوارا کیا۔

چونکہ مذہب کی بناء صرف یقین پر ہے اور فطرت انسانی صرف ان باتوں کا یقین کرنا چاہتی ہے جو خود اس کے مشاہدہ و تجربہ میں آئیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ علمی مشاہدات و تجربات کے مقابلہ میں مذہبی بیانات کو ترجیح دیجاتی اور انسانی ضمیر ان پر مطمئن ہو جاتا۔

اول اول جب مذہب و حکومت میں زیادہ فرق نہ تھا اور حکومت کے مفہوم سے اس کی مذہبیت کو جدا نہیں کر سکتے تھے، تو بر بناء اُس استبداد کے جو شخصی حکومتوں میں ہمیشہ پایا جاتا ہے، جبر ابزور شمشیر مذہب کا تلخ گھونٹ ہر شخص کو گوارا کرنا پڑتا تھا اور قوت و عسکریت سے علم و حکمت کی تبلیغ اور آزادی فکر و ضمیر کو محو کیا جاتا تھا، چنانچہ تمام مذاہب کی تاریخ میں

اس نوع کے سینکڑوں واقعات نظر آتے ہیں کہ فرعومات مذہب کے خلاف جب کسی نے نکتہ چینی کی تو اس کو قید و بند میں ڈالا گیا، دار پر کھینچا گیا، جلایا گیا، اور جس طرح ممکن ہوا حریت فکر و رائے کی اشاعت کو روکا گیا۔

جب یونان قدیم کے باشندوں نے، ایران، کریٹ اور مصر والوں سے علوم و فنون کے حصول کا ذوق حاصل کیا، اور اُنھوں نے محسوس کیا کہ روایات مذہبی بالکل لغو چیز ہیں اور انسان کو خود اپنے عقل و حواس سے کام لیکر کس نتیجہ پر پہونچنا چاہئیے، تو وہ جہاں بھی گئے اس خیال کو ساتھ لے گئے اور چونکہ یہ تاریخی صداقت ہے کہ جب کسی قوم میں آزادی اور تحقیق کی جستجو بڑھتی ہے تو مذہب کا انحطاط ہونے لگتا ہے، اس لئے اہل مذاہب نے ان کو ایک جگہ چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ جب وہ اثینہ (Athens) پہونچے جو اس زمانہ کا بڑا عظیم الشان شہر تھا۔ تو وہاں علم و حکمت کے ساتھ لوگوں کی دشمنی اور زیادہ شدید ہو ئی۔ یہاں تک کہ انکسا غورس نے جب وہاں ایک علمی درسگاہ قائم کرنا چاہی تو اس کی جان خطرہ میں پڑ گئی اور آخر کار اسے وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اثینہ کے فلاسفر کا دعوےٰ تھا کہ وہ صرف روحانی حقیقتوں کی طرف توجہ کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ غریب سقراط باوجود تبلیغ روحانیت اپنی جان نہ لیجا سکا۔

اس کے کئی صدی بعد اسکندریہ میں جسے یونانی مصری شہر کہنا چاہئیے، زیادہ موافق حالات کے ماتحت علم و عقل کی کارگاہ قائم ہوئی، ہر چند یہاں تے مذاہب پائے جاتے تھے کہ خداؤں کی تعداد کے لحاظ سے پجاری بھی کافی نہیں تھے۔ لیکن شاید مذہبی گمراہی کے ردعمل کا وقت تھا یا اور لوگوں نے کافی توجہ کی اور علم و حکمت کی ترقی ہونے لگی، مگر بدقسمتی سے اسی وقت ایک اور نئے مذہب مسیحیت نے سیاسی اقتدار حاصل کرلیا[52] اور اس نے یونانی عقل و حکمت کے آخری چراغ[51] (Hypatia) کو بھی گُل کرکے رکھدیا۔ پہلا ایک ہزار سال کا زمانہ جو (415 A.D.) سے شروع ہو کر (1415 A.D.) پر ختم ہوتا ہے، علم و مذہب کی جنگ کا نہایت اہم زمانہ ہوا ہے اور سب سے زیادہ جس مذہب نے عقل کی مخالفت کی وہ عیسوی مذہب تھا۔

---

۵۱ Hypatia اسکندریہ کے ایک ماہر ریاضیات و فلکیات کی لڑکی تھی۔ چوتھی صدی عیسوی کے اخیر میں پیدا ہوئی۔ اس کی فراست و دانائی کے سبب سے اسکندریہ میں اسکا خاص اثر تھا اور مشرق کے تمام حصوں سے طلبہ آ آ کر اس سے استفادہ کرتے تھے۔ اس نے فلسفۂ اشراقیین اور فلسفۂ ارسطو کو ملا کر ایک جدید فلسفۂ انتخابیت (Eclecticism) پیدا کیا تھا۔ یہ فلکیات اور علوم مسکانکی کی بڑی ماہر تھی۔ آخر کار وہاں کے اسقف اعظم نے بعض وحشی راہبوں کو متعین کیا جو اسے گاڑی سے کھینچکر کلیسہ میں لے گئے اور وہاں عریاں کرکے اس کے کوڑے مارے اور پھر ٹکڑے ٹکڑے کرکے جلا دیا۔

۵۲ (Thales) یونان کا نہایت قدیم فلاسفر تھا جو مسیح سے سات سو سال قبل پایا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سب سے پہلا یونانی تھا، جس نے تخلیق کائنات پر بحث کی۔ اور بتایا کہ ہر چیز پانی سے پیدا ہوئی ہے۔
(کل شئ حی من الماء)!

اس کے بعد صدیاں گزر گئیں اور علم کی روشنی مذاہب کے ظلمتکدوں میں نہ چھپ سکی۔ ہر چند علوم و فراست کے تمام خزانے یونانی کتابوں میں محفوظ تھے۔ لیکن یونان کی عیسائی حکومت کے زمانہ میں کس کو اُن کے تلاش کی جرات ہو سکتی تھی۔

آخر کار اسلام کا ظہور ہوا اور اس نے عرب کے وحشیوں میں وہ انقلاب عظیم پیدا کیا جس نے بعد کو دمشق و بغداد میں گہوارۂ علم و حکمت کی صورت اختیار کی اور چاروں طرف سے عقل کی روشنی سمٹ کر وہاں آنے لگی۔ یونانی، ایرانی اور شامی علوم عربی زبان میں منتقل ہونے لگے اور مذہب اسلام نے ان کی اشاعت کو گوارا کیا ہو یا نہ کیا ہو، لیکن خلفاء امراء، و سلاطین اسلام نے پوری ہمدردی و اعانت سے کام لیا۔ دمشق و بغداد سے منتقل ہو کر یہ تہذیب شمالی افریقہ ہوتی ہوئی اسپین پہونچی اور وہاں علوم و فنون کی ترقی نے وہی رنگ اختیار کیا جو یونان قدیم میں کسی وقت پایا جاتا تھا۔ اس کے بعد چند یہودی و مسیحی سیاح یہاں آئے اور عربوں کے تراجم و تصانیف کو اٹلی، فرانس اور انگلستان لے گئے۔ پھر چونکہ مسلمان صقلیہ اور اطالیہ کے جنوب میں بھی آباد تھے، اس لئے یہاں سے بھی چشمۂ علم یوروپ کی طرف بہا اور عقلیت کی ترقی ہونے لگی۔ لیکن کلیسہ نے جس قدر اس کی مخالفت کی وہ اس سے ظاہر ہے کہ بیکن کو اپنی آدھی زندگی زندانِ کلیسہ میں بسر کرنا پڑی۔ البرٹ گربرٹ کو کلیسہ کی اسقفِ اعظم کی خدمت دیکر خاموش کیا گیا، کوپرنیکس نے فیثاغورس کے اصول کی تصدیق کا اسوقت تک اعلان نہیں کیا جب تک وہ عذاب استنطاق (INQUISITION) کی دسترس سے باہر نہیں ہو گیا۔ آرنلڈ کا ایک مجرم کی طرح جا بجا تعاقب کیا گیا، جین ڈی روکیوٹالیڈ نے زنداں میں جان دی۔ سکو اسکولی اور برونو جلائے گئے۔ گلیلو سخت عذاب میں مبتلا کیا گیا اور دسالیس مشکل سے اپنی جان بچا سکا۔ لیکن چونکہ دنیا میں عقل و حکمت کی بنیاد پڑ چکی تھی اور اس کا نشہ ایسا نہیں جو آسانی سے اُتر جائے۔ اس لئے باوصف کلیسہ کی شدید ترین مخالفت کے اس کی اشاعت ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ جب مذہب میں ضعف ہوا تو اتنی رعایت اہل علم کے ساتھ روا رکھی جانے لگی کہ کیمیا، طبعیات و فلکیات کی تعلیم پر ان کا آگ میں جلایا جانا بند ہو گیا۔

جب انیسویں صدی شروع ہوئی اور اسی کے ساتھ علم و حکمت کے انشعابات نے ساری دنیا پر اپنا اثر ڈالنا شروع کیا، تو مذہب کے سخت گیر دیوتا کا بُت ٹوٹا اور عقیدت نے توریت و انجیل میں تاریخی، آثاری، علمی، اخلاقی، ہزاروں قسم کے نقائص نکال کر مسیحیت کا جنازہ نکالدیا۔ اور اب پہلی دفعہ ارباب علم و فن نے اطمینان سے بیٹھ کر سمجھا کہ دنیا کیونکر پیدا ہوئی، اسکی تاریخ کیا ہے؟ مذہب کسے کہتے ہیں؟ اور اس کی الہامی حیثیت کس مکر و فریب کا نام ہے۔ اور یہ آزادی خیال رفتہ رفتہ اس قدر بڑھی کہ اب گفتگو بائبل کے الہامی و غیر الہامی ہونے میں نہیں ہوتی۔ بلکہ سوال یہ کیا جاتا ہے کہ بائبل ایسی لغو و مہمل کتاب کو کیوں مدارس کے نصاب میں شامل کیا جائے۔ اور یہ کہ آیا مسیح کا حقیقتاً کوئی وجود بھی تھا یا نہیں۔

جو لوگ بائبل کو مدارس سے خارج کرنا چاہتے ہیں انھوں نے حسب ذیل دلائل پیش کئے ہیں:-

(۱) اگر بائبل الہامی ہے تو اس کا تعلق مذہب سے ہوا۔ لیکن اب کسی ملک کا کوئی سرکاری مذہب نہیں رہا ہے۔ لہذا کوئی ضرورت

نہیں کہ بچوں کے معصوم دلوں میں تعصبات مذہبی پیدا کئے جائیں۔ اگر بائبل الہامی نہیں بلکہ انسان کی تصنیف ہے تو اس میں کوئی ادبی خوبی نہیں ہے۔ اور اسکو پڑھانا بچوں کا وقت ضائع کرنا ہے۔

(۲) بائبل دو ہزار برس قبل کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ اور وہ زمانہ انسان کے عالم طفولیت کا تھا۔ اب انسان جوان ہے لہذا کوئی ضرورت نہیں کہ بچوں کی سی باتیں جوانوں کو پڑھائی جائیں۔

(۳) بائبل خود کوئی کتاب نہیں بلکہ مجموعۂ صحائف ہے۔ جو مختلف زمانوں میں تصنیف ہوئے۔ علاوہ ازیں بائبلوں میں بھی فرق ہے۔ یعنی عبرانی بائبل ۳۹ صحائف پر مشتمل ہے۔ انگریزی پروٹسٹنٹ بائبل میں صرف ۲۶ صحائف ہیں۔ رومن کیتھولک بائبل میں ان سب کے علاوہ ایک صحیفہ موسوم بہ "ابوقریفہ" (APOCRYPHA) اور بھی ہے۔ اس طرح سب ملاکر ۷۰ صحائف ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ سمجھنا مشکل ہے کہ کونسا مجموعہ صحیح ہے۔ لہذا ایسی مشتبہ کتاب کا پڑھانا مضرت رساں ہے۔

(۴) اصلی بائبل عبرانی زبان میں تھی۔ رائج الوقت بائبلیں اس کا ترجمہ ہیں۔ ترجمہ میں معانی اکثر بدل جاتے ہیں لہذا اگر بائبل پڑھی جائے تو اصل پڑھی جائے۔ ترجمہ کا پڑھانا فضول ہے۔ اور چونکہ اسکول کا ہر بچہ عبرانی نہیں پڑھ سکتا اور نہ ایک مردہ زبان کے پڑھانیکی ضرورت ہے۔ لہذا بائبل کے ترجمہ کا درس موقوف کیا جائے۔

(۵) بائبل میں ایسی باتیں لکھی ہیں جو علوم و انکشافات جدیدہ سے غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ لہذا غلط کتاب کا بچوں کو پڑھانا ان کے ذہنی رجحانات کو تباہ کرنا ہے۔

(۶) بائبل کے مختلف صحیفے مختلف حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں غزلیں بھی ہیں۔ قصے کہانیاں بھی ہیں، ڈرامے بھی ہیں، روایات بھی ہیں، خرافات بھی ہیں، اور تھوڑی سی تاریخ بھی ہے۔ اور یہ سب مختلف زبانوں کی تصانیف بھی ہیں، لیکن پڑھاتے وقت بچوں کو انکی نسبت کچھ نہیں بتایا جا سکتا، اس لئے ایسی مجہول کتاب کی تعلیم میں وقت کا ضائع کرنا ہے۔

(۷) بائبل میں بہت سے معجزات درج ہیں۔ جو از روئے سائنس خلاف فطرت ہیں۔ ان کے پڑھنے سے بچوں میں توہم پرستی پیدا ہوتی ہے۔ جو عقل و دماغ کے لئے مضر ہے۔

(۸) سائنس نام ہے عقل منظم اور دانش مرتب کا۔ لیکن بائبل نام ہے خلاف عقل باتوں کے مجموعہ کا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ عقلی پر بے عقلی کو کیونکر ترجیح دیجا سکتی ہے۔

(۹) بائبل مجموعۂ اضداد ہے۔ اور اس لئے وہ کوئی اخلاقی تعلیم بھی صحیح معنے میں نہیں دے سکتی۔

(۱۰) بائبل، ملوکیت اور مشرقی ظلم و استبداد سکھاتی ہے۔ مثلاً "خدا سے ڈرو بادشاہ کی عزت کرو" اور دنیا اب ملوکیت و استبداد کے اصول کو قائم نہیں رکھ سکتی۔

(۱۱) بائبل عورت کو ذلیل بتاتی ہے۔ حالانکہ از روئے انصاف مرد و عورت دونوں کا درجہ مساوی ہونا لازم ہے۔

(۱۲) بائبل جنگ کی تعلیم دیتی ہے۔ حالانکہ دنیا کو امن و صلح کی ضرورت ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحی مذہب کے فنا ہونیکے چند در چند اسباب تھے۔ ایک یہ کہ اس کی تعلیمات ترقی علوم و فنون کا ساتھ نہ دے سکتی تھیں، دوسرے یہ کہ دنیا سے ملوکیت و استبداد کی رسم اُٹھی اور اصول حکمرانی میں مذہب سے کوئی تعلق نہ رکھا گیا۔ تیسرے یہ کہ لوگوں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ بائبل سے ان کی زندگی کی کوئی ضرورت وابستہ نہیں ہے اور نہ وہ حیات انسانی کی جستجو کا شافی جواب دے سکتی ہے۔ اس کا تاریخی پہلو بالکل لغو علمی پہلو بالکل مہمل ہے۔ اس کی اخلاقی تعلیم یکسر ناقابل عمل ہے۔ وہی یوروپ جس نے مسیح اور تعلیم مسیح کی حمایت میں شدید ترین ظلم کرنے سے بھی محجاب نہ کیا تھا آج اس کا یہ عالم ہے کہ وہ مسیح کو جاہل محض اور بائبل کو مجموعۂ مزخرفات بتاتا ہے۔ وہ انجیل کی اس روایت کو دیکھتے ہیں جس میں یونس کا تین دن تین رات تک مچھلی کے پیٹ میں رہنا بیان کیا جاتا ہے، اور ہنستے ہیں، وہ علانیہ کہتے ہیں کہ مسیح کو اتنا علم دنیا اور قدرت کا حاصل نہ تھا جتنا آج ایک اسکول کے لڑکے کو حاصل ہے۔ نہ وہ تاریخ سے آگاہ تھے نہ جغرافیہ سے نہ علم الحیات سے ان کو آگاہی تھی۔ نہ طبیعیات سے، نہ فلکیات کا علم اُنھیں حاصل تھا، نہ سیاسیات کا۔ رہ گئی تعلیم اخلاق سو اُس کا یہ حال ہے کہ نہ پہلے کبھی اس پر کوئی انسان عمل کر سکتا تھا نہ آج اس کا امکان ہے۔

فرض کیجئے گزشتہ جنگ کے موقع پر مسیح اتحادیین کی جنگی کونسل کے موقعہ پر موجود ہیں، اور ان سے پوچھا جاتا ہے کہ دشمن کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ وہ کہتے ہیں" اپنے دشمن سے محبت کرو"۔ دریافت کیا جاتا ہے" کیا ایسے دشمن سے محبت کی جاسکتی ہے جو سر سے پاؤں تک مسلح حالت میں ہو کر گھر تباہ کرنے کے لئے کھڑا ہوا ہے"۔ وہ فرماتے ہیں" اگر کوئی تمہارے داہنے گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا گال بھی سامنے کردو"۔ پھر پوچھا جاتا ہے کہ" دشمن کے تمام مظالم کا کیا علاج ہے"۔ مسیح جواب دیتے ہیں" جو تم سے نفرت کرتے ہیں، ان کے ساتھ بھلائی کرو، ان کے لئے دعائے خیر مانگو جو تم سے بُرا سلوک کرتے ہیں"۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ عقل کی باتیں ہیں اور اگر مسیح واقعی جنگی کونسل میں شریک ہو کر یہی تلقین کرتے تو اُنکے ساتھ وہی سلوک نہ ہوتا جو کسی وقت یہودیوں اور اہل رومہ نے کیا تھا۔ یقیناً ہوتا کیونکہ مسیح کی یہ تلقین اخلاق آج بہ لحاظ سیاست و تجارت، تمدن و معاشرت، ایسی لغو و ناقابل عمل تعلیم ہے کہ اس سے زیادہ ناقص ذہن انسانی میں کوئی اور بات آہی نہیں سکتی۔

مسیح کہتے ہیں کہ" اگر کبھی ایک حقیر سی چڑیا بھی مر کر زمین پر گرتی ہے تو آسمانی باپ کا دل دُکھ جاتا ہے"۔ لیکن اگر واقعی کوئی آسمانی باپ ہے تو ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ کیوں نہیں وہ ان تمام مظالم کو روکتا جو حقیر چڑیا کیا معنی بڑی بڑی انسانی ہستیوں کو تباہ کرتے رہتے ہیں۔

مسیح کا ارشاد ہے کہ" آسمانی باپ سر کے تمام بالوں کا شمار رکھتا ہے"۔ لیکن ایک سائنس داں دریافت کرسکتا ہے کہ کیا وہ آسمانی باپ اُن خوردبینی خلایا کا بھی شمار رکھتا ہے، جو رحم کے اندر خدا معلوم کسی مقدس راہب کی تعمیر میں مصروف ہیں یا کسی قزاق و رہزن کی آفرینش میں۔

مسیح فرماتے ہیں :- "ایک باپ اپنے بیٹے کو روٹی دینے پر بھی قادر نہیں ہے، یہ آسمانی باپ ہی کا کام ہے جو مانگنے والوں کو دیتا ہے اور ان کی دعائیں قبول کرتا ہے" لیکن آج تک نہیں دیکھا گیا کہ کسی مرنے والے کی ماں یا بیوی کی دعا اس کی جان بچانے میں مقبول ہوئی ہو، یا کوئی بڑے سے بڑا راہب، مولوی یا ولی اس کا دعویٰ کر سکے کہ وہ اپنی دعا سے رائفل کی گولی کو راستہ میں روک دے گا۔ اب وہ زمانہ ہے جب دنیا اس حقیقت کو جان گئی ہے کہ اگر ہمارا رومال کثیف ہے تو اسے ایک پیسہ کا صابن ہی صاف کر سکتا ہے اور اگر سارے زمانہ کے اولیائے کرام اپنی تمام عمر محض دعا کی مدد سے اس کو صاف اور اُجلا کرنے کی کوشش میں صرف کریں تو کامیاب نہ ہوں گے۔

مسیح کہتے ہیں "آسمانی باپ کتنا مہربان ہے جو اچھے بُرے دونوں پر پانی برساتا ہے" حالانکہ علمی نقطۂ نظر سے یہ امر کس قدر مضحکہ خیز ہے، اگر واقعی پانی کا برسانا اسی آسمانی باپ کے ہاتھ میں ہے تو وہ اپنے اس اختیار کو کسقدر بے اصولی سے استعمال کرتا ہے کہ جہاں ضرورت نہیں وہاں تو وہ سیلاب کے سیلاب برپا کر دیتا ہے اور جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں ایک قطرہ پانی کا نہیں گرتا اور ہزاروں لاکھوں انسان قحط سے مرجاتے ہیں۔

مسیح کا نظریہ عفو و درگزر کے باب میں "سات ستر مرتبہ" ہے یعنی ۴۹۰ بار۔ انگلستان کا وزیر حربیہ مسیح سے پوچھتا ہے کہ "ہم ایک جرمن آبدوز کشتی کے کپتان کو جس نے ایک اسپتالی جہاز ڈبو دیا ہے کتنی مرتبہ معاف کریں"؟ جواب ملتا ہے "جبتک وہ ۴۹۰ اسپتالی جہاز نہ ڈبو چکے۔ ایک حاکم عدالت دریافت کرتا ہے کہ "ایک شخص کو جو اپنی بیوی کو بے قصور چھوڑ رہا ہے اور اس کے معاش کا کفیل نہیں ہوتا کتنی مرتبہ معاف کرکے رہا کریں۔ "وہی ۴۹۰ مرتبہ"! مسیح کہتے ہیں "ہاں"۔

وزیر حربیہ اور مجسٹریٹ دونوں یہ جواب سن کر اپنے ماتحتوں سے کہتے ہیں کہ "مسیح تو یونہی کہا کرتے ہیں، تم تو اس جرمن آبدوز کے کپتان کو فوراً گولی سے مار دو اور اس شخص کو جیل میں بند کر دو جبتک ۳۰ پونڈ ماہوار بطور معاش اپنی بیوی کو دیتے رہنے کی ضمانت نہ داخل کرے"

الغرض جس حد تک مذہبی معتقدات کا تعلق ہے۔ مسیحیت کا وجود دنیا میں باقی نہیں رہا، اور نہ موجودہ علمی و تمدنی ترقیوں کے زمانہ میں اس کے باقی رہنے کی کوئی صورت تھی۔ اسوقت یوروپ و امریکہ کا اپنے آپ کو مسیحی یا عیسائی کہنا حقیقتاً ایک قومی یا نسلی تعین سے زیادہ کوئی مفہوم نہیں رکھتا اور نہ دنیا میں کوئی مذہب باقی رہ سکتا ہے اگر وہ زمانہ کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں، اگر اس کی تعلیمات اس قدر وسیع جامع اور حاوی ہیں کہ ترقی ذہن و خیال کی رفتار کا ساتھ دے سکیں تو بیشک اس کا وجود باقی رہ سکتا ہے، ورنہ اس کے قائم رہنے کی کوئی وجہ نہیں۔

اب ان تمام تمہیدی بیانات کے بعد آئیے مذہب اسلام پر غور کریں کہ اسکی حقیقت کیا ہے اور اس کے متعلق یہ دعوےٰ کرنا کہ وہ مذہبی دنیا میں آخری لفظ کی حیثیت رکھتا ہے کس حد تک صحیح ہے۔

مذہب اسلام کی تعلیمی حقیقت معلوم کرنے کا ذریعہ قرآن ہے اور اس کے بعد محمدؐ کی سیرت کہ ان دونوں میں

اصولاً کوئی فرق نہ ہونا چاہئے۔ ان دو ذریعوں کے علاوہ جو کچھ ہے یعنی احادیث کا مجموعہ اور مذہب اسلام کی تاریخ ان کو کوئی حقیقی یا معیاری ذریعہ تحقیق کا نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ان سے اگر کوئی کام لیا جا سکتا ہے تو صرف یہ کہ اسلام نے خیالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ زمانہ کی کس قدر موافقت کی، لوگوں نے اسلام کے مفہوم میں کیا کیا تغیرات پیدا کئے، اور یہ کہ اس میں حشو و زوائد کا اضافہ کب اور کن اسباب کے ماتحت ہوتا رہا۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم اسلام کی تعلیمات سے بحث کریں، مذہب کے مفہوم کو متعین کر لینا ضروری ہے۔

مذہب اگر انسان کے لئے کوئی ضروری چیز ہے تو دیکھنا چاہئے کہ یہ ضرورت اس کی فطرت کے اقتضاء سے پیدا ہوئی ہے یا صرف ماحول کے اثر سے۔

اس کا جواب دینے کے لئے زیادہ غور و تامل کی حاجت نہیں، ابتدائے آفرینش سے لیکر اسوقت تک انسان کی تاریخ اس نتیجہ پر پہونچنے میں ہماری مدد کرتی ہے کہ مذہب کا خیال بڑی حد تک فطری چیز ہے اور وہ محض اس لئے کہ انسان بالطبع متمدن پسند ہے اور تمدن کا نظام بہت کچھ منحصر ہے، کسی اعتقادی قانون پر۔ یہ ضرور ہے کہ ماحول کے اثر سے مذہبی خیالات میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے، لیکن مذہب کا خلاق ماحول نہیں ہے۔ بلکہ فطری اقتضاء ہے۔

اس لئے ایک مذہب کے بہترین مذہب ہونے کی علامت اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ اصول فطرت کے مطابق ہو، یعنی فطرت انسانی اپنے اکتسابات کے لحاظ سے جسقدر ترقی کرتی جائے، مذہب نہ صرف یہ کہ اس کا ساتھ دے بلکہ ہمیشہ ترقی کا ایک بلند نصب العین سامنے رکھے۔ یہ ایک ایسا اصول کسی مذہب پر تنقید کرنے کا ہے کہ اس کی صحت سے غالباً کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اچھا تو آئیے سب سے پہلے اسی کو سامنے رکھکر اسلام کی جانچ کریں کہ وہ کس حد تک اس معیار پر پورا اترتا ہے۔

قرآن میں مذہب اسلام کی حقیقت جن الفاظ میں بیان کی گئی ہے، یہ ہیں:۔

فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا۔ ولا تبدیل لخلق اللہ۔ ذالک الدین القیم۔ یعنی اسلام نام ہے صرف اس فطرت الٰہی کا جس پر انسان پیدا ہوا ہے، اور فطرت الٰہی یہ ہے کہ جو قانون نظام عالم کا اس نے بنا دیا ہے اس میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا اور یہی وہ مسلک و مذہب ایسا ہے جو ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔ ان چند الفاظ میں جو فلسفہ مذہب کا بیان کیا گیا ہے وہ اس قدر حاوی اور ایسا مکمل ہے کہ زمانہ خواہ کتنی ہی ترقی کرے اس کی صداقت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ:۔

"مذہب اسلام فطرت انسانی کا ساتھ دینے والا ہے اور اس بام ترقی تک پہونچانیوالا ہے جو انسان کے تمام قواء کا منھ کو بروئے کار لانے کے بعد بہ آسانی حاصل ہو سکتا ہے۔ پھر اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ ترقی کے اصول کیا ہیں؟ یعنی اسی کلیہ کو ہمیشہ سامنے رکھنا کہ جو اصول نظام عالم اور دار تقاء کا قدرت نے مقرر کر دیا ہے اس میں کبھی

تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی، اور ایک انسان کا فرض ہے کہ ہمیشہ سعی و کوشش سے کام لیکر ترقی کی راہیں پیدا کرے۔ اسی اصول کو خدا نے کہیں آیات محکمات کہا ہے، کسی جگہ لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا سے تعبیر کیا ہے، کبھی بصائر للناس بتایا ہے اور کبھی حبل اللہ سے اس کی صراحت کی ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ اگر انسان اس امر کو سمجھ کر کاربند ہوا اور اگر اُس نے اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ "لیس للانسان الا ما سعیٰ" (ایک شخص کو اتنا ملے گا جتنی وہ کوشش کرے گا)، تو پھر اس کا نتیجہ کیا ہوگا، ترقی کی صورت کیا ہو گی، ارشاد ہوتا ہے کہ:- وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصٰلحٰت لیستخلفنھم فی الارض یعنی اگر لوگوں نے مقررہ اصول حیات و ترقی کا یقین کر لیا اور اُنھوں نے اس پر کاربند ہو کر سعی و کوشش کی تو ہمارا وعدہ ہے کہ ہم ان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنا دیں گے۔ کرۂ ارض کا وارث کر دیں گے اور وہ نائب خدا ہونے کی حیثیت سے زبردست اقتدار و حکومت کے مستحق قرار پائیں گے۔

یہ ہے اصل روح اس تعلیم کی جو مذہب اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کی اور دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے زیادہ عملی تعلیم نہ اس سے قبل کسی مذہب نے دی اور نہ آئندہ اس میں کسی اضافہ کی گنجائش ہے۔

اسلام کی اولین شرط توحید ہے، لیکن چونکہ عام طور پر اس کا مفہوم غلط سمجھا جا رہا ہے، اس لئے مختصراً اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔ آپ جس مولوی سے پوچھیئے گا کہ توحید کسے کہتے ہیں، وہ یہی جواب دے گا کہ خدا کو ایک ماننا توحید ہے، حالانکہ اس مفہوم کی غلطی اسی سے ظاہر ہے کہ جب خدا کو زمان و مکان سے بے نیاز مانا جاتا ہے تو اس کو ایک کیسے کہہ سکتے ہیں؟ جبکہ ایک کے مفہوم میں زمان و مکاں دونوں شامل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک کا مفہوم لوگوں نے بالکل غلط لیا ہے۔ اس سے مقصود وہ مفہوم ہے جو لفظ کُل سے ظاہر کیا جا سکتا ہے، اسی لئے میرے نزدیک اگر خدا کا کوئی موزوں و مناسب نام ہو سکتا ہے تو وہ صرف کُل ہے اور اسی کو اسکا اسم اعظم قرار دینا چاہیئے۔ یہ مفہوم خدا کا ایسا ہے جس میں نہ کبھی شائبۂ شرک پیدا ہو سکتا ہے، اور نہ وہ صورتیں جو عام طور پر شرک سمجھی جاتی ہیں، داخل شرک ہو سکتی ہیں۔

خُدا کو کُل سمجھنا، یعنی اس کو تمام کائنات کا محیط اعظم، دائرۂ کونین کا مرکز حقیقی موجودات کا خالق اصلی، عالم اسباب کا علۃ العلل قرار دینا، یہی مفہوم ہے اسلام کی توحید کا اور یہی مدعا ہے صوفیہ کی وحدت الوجود کا۔ لیکن فرق یہ ہے کہ صوفیہ نے وحدت الوجود کو خوارق عادات اور کرامات فوق العادت کی بنیاد قرار دے کر اپنے آپ کو عضو بیکار بنا لیا اور سائنس نے اس کُل کو مظاہر جزئیات سمجھنے کی کوشش کی اور صحیح معنے میں علم "خلیفۃ اللہی" بلند کیا۔

میں ہرگز یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ اگر کوئی شخص بُت پرستی کرتا ہے، تو وہ شرک میں مبتلا ہے، کیونکہ بُت پرستی حقیقتاً اسی کُل کے مختلف مظاہر و آثار کا مطالعہ ہے اور دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو یہ سمجھتا ہو کہ تمام

کاموں کا انحصار حقیقتاً انھیں پتھر کی مورتوں پر ہے۔

خدا کے مفہوم کی تعین میں سب سے بڑی غلطی ہر جگہ اور ہر زمانہ میں یہ ہوئی ہے کہ اس کو دنیا کے انسانی بادشاہ کی طرح پیش کیا گیا۔ جو خوش بھی ہو سکتا ہے، اور برہم بھی، حالانکہ ان دونوں کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا اگر کوئی شخص عمر بھر خدا کو گالیاں دے تو وہ برہم ہو کر اپنے قانون کو نہیں بدل سکتا، اور اگر کوئی ہر وقت سجدہ ہی میں پڑا رہے تو خوش ہو کر اس کی سعی سے زیادہ نہیں دے سکتا، اس لئے یہ سمجھنا کہ اگر کوئی قوم بتوں کے سامنے جھکتی ہے متعدد خداؤں کی قائل ہے، تو وہ صرف اسی وجہ سے عند اللہ مغضوب ہے، درست نہیں، البتہ اگر اس کی بت پرستی یا شرک اُسے اوہام باطلہ میں مبتلا کر کے اس نصب العین سے ہٹا دینے والے ہیں، جو خدا کو واحد یا کل ماننے کی حالت میں سعی و عمل، کاوش و جستجو، اقدام و ترقی کی صورت میں رونما ہوتا ہے تو بے شک ہم کہہ سکتے ہیں کہ فطرت اس سے برہم ہے اور اس کی برہمی یہی ہے کہ ہم دنیا میں ذلیل و حقیر رہیں، اور غلامی و اسیری کی زندگی بسر کریں۔

انتم الاعلون ان کنتم مومنین (تم کو بلند مرتبہ والا ہونا چاہیئے اگر تم مومن ہو) اسلام کی تعلیم ہے، اور یہیں سے ایمان کی حقیقت واضح ہوتی ہے، اور اُس توحید کی جو ایمان کی بنیاد ہے۔ فرض کیجئے ایک شخص تمام عمر خدا کے ایک ہونے کا وظیفہ رٹتا رہے، لیکن وہ اس کے حقیقی مفہوم سے نا آشنا رہتے ہوئے، سوائے مسجد میں اذان دینے کے اور کچھ نہیں کرتا تو کیا ایسے انسان کو اُن مومنین میں شامل کر سکتے ہیں، جن کے ایمان کا نتیجہ لازمی اقتدار و مرتبہ بلند بتایا گیا ہے۔

اس لئے اگر ایمان و اسلام کی بنیاد توحید ہے، تو اس توحید کے معنے یہ نہیں ہیں کہ خدا کو ایک سمجھا جائے، بلکہ اُس کو محیط کل باور کیا جائے، اصول فطرت کا مطالعہ کیا جائے، عالم اسباب پر نگاہ ڈالی جائے، اجتہاد و عمل کو معمول بنایا جائے، دماغی و ذہنی قوتوں سے کام لیا جائے اور کائنات کو مسخر کر لیا جائے۔ چنانچہ صراحۃً بیان ہوتا ہے کہ:-

وسخر لکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعاً منہ ان فی ذالک
لآیات لقوم یتفکرون ۝

آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ سب تمہارے تابع فرمان ہے، لیکن شرط یہی ہے کہ تم غور و فکر، تامل و تدبر، سعی و کاوش سے کام لو۔ پھر دیکھو کہ کیا بحر و بر کی تسخیر انسان کے لئے ناممکن ہے، کیا جبال و انہار پر آج انسانی اقتدار نہیں پایا جاتا۔ پانی، ہوا، آگ، بجلی، بادل، فضا، روشنی، حرارت، ہوا کے طیور، زمین کے چوپائے، پہاڑوں کے معدنیات پانی کے وجودات، الغرض دنیا میں کوئی چیز، کوئی کیفیت، کوئی قوت ایسی نہیں ہے، جو آج انسان کے اقتدار سے باہر ہو، لیکن کیا دنیا کا کوئی مذہب اس کا دعوے کر سکتا ہے کہ اس نے انسان کی ان جملہ ذہنی ترقیوں کا درس اسی طرح کھلے ہوئے الفاظ میں دیا ہے جیسا قرآن میں پایا جاتا ہے۔ اسلام نام ہے صرف قرآن کے تعلیمات پر عمل کرنے کا، اور اس لئے ہر وہ جماعت جو اس کی عامل ہے، مسلمان کہلائے گی خواہ وہ مسیح کی اولاد میں سے ہو، یا رام و لچھمن کی ذریات میں سے اور

جو اس پر عامل نہیں ہے، وہ یقیناً کافر، مشرک اور غیر مسلم کہلائے گی۔ خواہ وہ آل فاطمہ ہی سے کیوں نہ نسبت رکھے۔ یہ ہے قرآن کا فیصلۂ آخرین جو اس نے ایک مسلم و کافر کی تفریق و امتیاز کے متعلق سب کو سُنا دیا ہے، اور جس میں کبھی کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہو سکتی، خواہ انسانی ذہن و تمدن کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے۔

آپ تمام قرآن کو دیکھ ڈالئے، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ کی چھان بین کر لیجئے: ہر جگہ تعلیم کی یہی عمومیت درس کا یہی احاطۂ کامل اور تہذیب عمل کی یہی ہمہ گیری نظر آئے گی، عبادات کی تعلیم، صلاح و تقدس کا درس غور و تامل کی ہدایت، تفکر و تدبر کی تاکید، الغرض ہر ارشاد اُسی ایک اصول ترقی پر منحصر ہے، اور کسی جگہ رسمی، ظاہری، بےمعنی طاعت کو مقصود قرار نہیں دیا گیا۔ نماز میں بھی اسی وحدت عمل کا نظارہ ہے، روزہ میں بھی اسی احساس انسانیت کی تعلیم ہے، زکوٰۃ میں بھی وہ تعاون و ہمدردی کا سبق ہے، حج میں بھی وحدت عمل مقصود ہے، اور جہاد نفس و مال اس محنت و جفاکشی، اُس ایثار و قربانی کی تعلیم ہے، جو اساس ارتقاء، اور بنیان اخلاق ہے۔

اس سے قبل ہم بیان کر چکے ہیں کہ سب سے زیادہ صدمہ مذاہب کو جس چیز سے پہونچا وہ ڈاروِن کا اصول ارتقاء (EVOLUTION) تھا، لیکن اسلام اس لحاظ سے بھی تمام مذاہب سے ممتاز نظر آتا ہے، کیونکہ سب سے پہلے جس نے اس مسئلہ کی حقیقت پر گفتگو کی وہ اسلام ہی کا پیرو، ابو نصر محمد فارابی تھا اور ڈاروِن سے بہت قبل ابن سینا، ابن باجہ اور ابن مسکویہ، حکمائے اسلام ہی تھے، جنھوں نے اصول ارتقاء کو بڑی حد تک مدون کیا۔

ممکن ہے آج مولوی اس کو بھی کفر و الحاد کہے اور قدیم حکمائے اسلام کو کافر و ملحد کے خطاب سے یاد کرے، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ قرآن میں خود اس مسئلہ کے مختلف مدارج و اصول کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ آج چونکہ ڈاروِن کے نام سے یہ نظریہ منسوب کیا جاتا ہے، اس لئے مسلمانوں کو اس کے قبول کرنے میں پس و پیش ہوتا ہے، علمائے کرام اس کی تضحیک کرتے ہیں، حالانکہ اگر نظر وسیع ہوتی تو ان کو معلوم ہوتا کہ اس نظریہ کے دریافت کا فخر بھی فرزندان اسلام ہی کو حاصل ہے، اور قرآن میں خود جا بجا اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:-

۱- ربنا الذی اعطیٰ کل شئ خلقہ ثم ہدیٰ۔

(میرا خدا وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی فطرت و جبلت عطا کی اور پھر ترقی کی طرف مائل کیا)

کیا ڈاروِن کے اصول انواع کا کوئی دوسرا مفہوم ہے۔

۲- لیس للانسان الا ما سعیٰ - رفع بعضکم فوق درجات۔

کیا تنازع للبقاء اور صلاحیت کے لحاظ سے، مختلف درجات قیام کی تعیین اور بقاء اصلح کو ان سے بہتر الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ کیا کلام مجید میں مومنین، مسلمین، صالحین، قانتین وغیرہ کے جو سینکڑوں الفاظ آئے ہیں، وہ افراد اصلح کو ظاہر نہیں کرتے اور کیا (SURVIVAL OF THE FITTEST) کا کوئی اور مفہوم ہو سکتا ہے۔

۳- ھوالذی انشاء کم من نفس واحدۃ فمستقر ومستودع۔

کیا موجودہ علم الحیات کا یہ مسئلہ کہ آفرینش کا سلسلہ صرف ایک نفس سے ہوا ہے جسے (PROTON) بھی کہتے ہیں، کوئی دوسری چیز ہے۔ کیا مستقر سلسلۂ آفرینش کے مختلف مدارج کو ظاہر نہیں کرتا اور کیا مستودع سے سلسلۂ آفرینش کی آخری مکمل کڑی (انسان) کی طرف اشارہ نہیں ہے۔

الغرض نظریۂ ارتقاء کا کوئی اصول ایسا نہیں ہے، جس کی طرف قرآن نے رہبری نہ کی ہو۔ اور اس لئے تمام مذاہب عالم میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو علم و حکمت کے اس محکم ترین نظریہ کا ہم آہنگ نظر آتا ہے اور پھر ایک اسی مسئلہ پر کیا موقوف ہے، تمام وہ مسائل جو اساسی طور پر کسی نہ کسی نہج سے مذہب کے متصادم ہو سکتے ہیں۔ سب کے لئے قرآن میں بہترین اشارات پائے جاتے ہیں، اور ایسے مستحکم و مضبوط کہ ذہن انسانی اپنے بلند ترین نقطۂ عروج پر پہونچنے کے بعد بھی ان میں جنبش پیدا نہیں کر سکتا۔

فلکیات میں بطلیموس اور ارسطاطالیسی نظام کی تردید سب سے پہلے جس نے کی وہ قرآن ہی تھا کہ اس نے ان اجرام کو کل فی فلک یسبحون کہکر یہ بتایا کہ یہ سب کے سب اپنے مدار پر گردش کر رہے ہیں۔ اس کے بعد کوپرنکی نظام قائم ہوا جس میں غلطی سے سورج کو اپنی جگہ ساکن مانا گیا، پھر ایک زمانہ کے بعد ہرشل نے گزشتہ صدی میں ثابت کیا کہ آفتاب مع اپنے تمام سیارگان کے خود کسی اور چیز کا طواف کر رہا ہے، حالانکہ قرآن اس سے بہت قبل اس حقیقت کا اظہار کر چکا ہے کہ والشمس تجری لمستقر لہا۔ اسی طرح علوم جدیدہ کے اور بہت سے اساسی مسائل ایسے ہیں جو تعلیمات قرآنی کے احاطہ سے باہر نہیں ہیں اور اس لئے اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو ہر زمانہ کی ترقی کا ساتھ دے سکتا ہے تو یہ دعوےٰ غالباً غلط نہ ہوگا۔

اب رہ گئی اس کی اخلاقی تعلیم جو حقیقتاً اساس تہذیب و تمدن ہے، سو اس کے متعلق غالباً مخالفین کو بھی انکار نہ ہوگا کہ اسلام سے زیادہ عملی درس دینے والا، اور زندگی کو اکسیر اضطراب عمل ثابت کرنیوالا کوئی اور مذہب نہیں ہے۔ دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کی بنیاد نہ خرافیات پر ہے نہ صنمیات پر، نہ جس کا انحصار اساطیر الاولین کے ماننے پر ہے نہ کسی مخصوص رسم و رواج اور طریق عبادت و نمائش پر، اس نے صرف ایک تعلیم دی ہے کہ دنیا میں آئے ہو تو کائنات پر غور کرو، مظاہر قدرت کا مطالعہ کرکے اپنی اُن قوتوں کو بروئے کار لاؤ، جو تمہارے اندر ودیعت کر دی گئی ہیں، نظام تمدن میں ایک عضو مفید کی حیثیت پیدا کرو، ابنائے جنس کے ساتھ ہمدردی کرو اور اپنی سعی و کوشش سے دنیا کو اپنے لئے فردوس بنالو۔ پھر جو شخص ان اصول پر کاربند ہے وہ حقیقتاً اسلام ہی کے اصول پر کاربند کہلائے گا خواہ وہ کسی رنگ و نسل کا ہو اور جو اس پر عامل نہیں ہے اُس کو مسلمان کہلائے جانے کا کوئی حق حاصل نہیں، خواہ حطیم کعبہ ہی کے اندر اس کی ماں نے کیوں نہ اسکو جنا ہو۔

نماز اُصولاً ورسِ اجتماع ہے، زکوٰۃ اصولاً جذبۂ تعاون ہے، روزہ اصولاً حسیاتِ لطیف کی بیداری ہے، اور حج اخوت و انسانیت کا احساس وسیع پیمانہ پر۔ اس لئے اگر قوم کو ایک شیرازہ میں منسلک کرنے کے لئے ان کے لئے مخصوص قواعد مرتب کئے جائیں۔ تو تعلیم الٰہی کے منافی نہیں ہو سکتا۔ لیکن چونکہ یہ تمام قواعد و ضوابط صرف سوسائٹی سے متعلق ہیں۔ اور انسانی معاشرت کو اسلوب بلند پر لانے کے لئے ہمیشہ ایسے قوانین مرتب کئے جاتے ہیں جو جماعت کے افراد میں باہم انتشار خیال و اختلاف اعمال کے امکانات کو دور کرکے ہیئت اجتماعی کو متاثر نہ ہونے دیں، اس لئے یہ بالکل یقینی ہے کہ آج کا بنایا ہوا قانون کل اور کل کا بنایا ہوا پرسوں کام نہیں دے سکتا۔ اور اس میں زمانہ و ملک کے لحاظ سے تبدیلی کا ہونا ضروری ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جسکو ہمارے علمائے کرام نے نہیں سمجھا اور یہی مسئلہ میرے ان کے درمیان استخوانِ جنگ بنا ہوا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ اسلام اور اسلامی فقہ ایک چیز ہے، میں کہتا ہوں کہ ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام نام ہے صرف ایک مخصوص طریقہ سے عبادت کرنے کا، مقررہ قواعد کے ماتحت روزہ رکھنے کا متعین مقدار کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرنے کا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ طریقے اور قاعدے اصل چیز نہیں ہیں بلکہ ہر زمانہ کے لحاظ سے بدل جانے کی چیزیں ہیں اس لئے نہ ان پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے اور نہ ان کو مذہب میں داخل کرنے کی۔ بلکہ اگر آج ترقی تمدن ضروریات معاشرت، اقتضاء مشاغل یا کسی اور مصلحت کی بنا پر جس کی رعایت ہماری دنیوی فلاح کے لئے ضروری ہے، فقہ کو بدل ڈالنا اصول عبادت میں تغیر و تبدل کر دینا، ضابطۂ معاشرت میں ترمیم و تنسیخ کر دینا، مناسب ہو تو ایسا کر دینا چاہیئے اور یہی اولین فرض ہے، ایک ذی شعور عالم دین کا۔ ایک صاحب فہم اخلاقی رہبر کا۔ اور ہر اُس ہادی مذہب کا جو اسلام کے صحیح مفہوم سے آشنا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایسا کرنا تحریف مذہب ہوگی، اور اس سے قبل کبھی ایسا نہیں ہوا۔ تو دعوےٰ بالکل غلط ہوگا، کیونکہ اگر یہ اختلاف نہ ہوتا تو آج حنبلی فقہ، حنفی فقہ، شافعی فقہ کی تفریق کیوں ہوتی۔ اشاعرہ و معتزلہ کی جماعتیں کیونکر پیدا ہوتیں، قرون اولےٰ میں تاویلات کا دروازہ کیوں کھلتا، اجتہادات و قیاسات میں اختلاف کیوں ہوتا اور اقوال آئمہ و مجتہدین میں اس قدر اصولی اختلافات کیسے پیدا ہوتا کہ آج یقین کے ساتھ یہ کہنا بھی دشوار ہے کہ رسول اللہ واقعی ہاتھ باندھکر نماز پڑھا کرتے تھے یا ہاتھ کھول کر۔

ظاہر ہے کہ کسی مذہب کی بنیاد وہ مسائل نہیں ہوا کرتے جن میں لوگوں کے اختلاف کو گوارا کیا جا سکتا ہے، بلکہ اساس مذہب صرف وہ مقصود ہوتا ہے جو مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اور جس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا، پھر مذہب اسلام کا اساسی اصول صرف ایک ہے، جسے قرآن میں ہر جگہ ظاہر کیا گیا ہے کہ دنیا میں اخوت عامہ و انسانیت کے رشتہ کو مضبوط کرو۔ اور ہر ممکن ترقی کے حصول پر آمادہ ہو جاؤ۔ اگر اس سے کسی کو اختلاف ہو تو بیشک ہم کہیں گے کہ وہ اسلام سے خارج ہے انسانیت سے علحدہ ہے، لیکن جبتک کوئی شخص اس اصلی تعلیم کو مان رہا ہے اور اس پر عامل ہے اُسوقت تک کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اسے دائرۂ مذہب سے خارج کر دے، خواہ وہ نماز کا عادی ہو یا نہ ہو، روزہ رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ یہ درست

ہے۔ کہ قرآن میں ان شعائرِ اسلامی کی پابندی کا ذکر موجود ہے۔ لیکن صرف ایک مختص الوقت و مختص المقام قانون کی حیثیت سے اور آج اگر ضرورت ہو تو ان کو بدلا جا سکتا ہے۔ بغیر اس کے کہ کلام مجید کی عظمت کو اس سے صدمہ پہونچنے کا اندیشہ ہو۔

حقیقت سے ہٹ کر فروع کو اصل قرار دینے کی داستان بہت طویل ہے اور اگر اس کی تاریخ کا سُراغ لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی بنیاد عہد سعادت کے ختم ہوتے ہی پڑ گئی تھی، لیکن بعد کو اس میں اور اضافے ہوتے گئے گمراہیوں میں اشتداد ہوتا رہا۔ صراطِ مستقیم سے ہٹنے کے بعد زیادہ پیچ در پیچ راہوں میں اُلجھتے گئے، یہانتک کہ آج اسلام کا مفہوم ہی بالکل بدل گیا۔ اور وہ انسانیت کی سطح بلند سے گر کر رسم و رواج، اوہام باطلہ، عقاید سخیفہ، مفروضات ردیہ اور مزعومات کاذبہ کا مجموعہ ہو کر رہ گیا۔ اور چونکہ گمراہی شدید ہے، ضلالت سخت ہے، اور اسلام کا درس اولین دماغ سے بالکل محو ہو چکا ہے۔ اس لئے اب جو صحیح بات بتائی جاتی ہے تو اس کو بھی غلط سمجھا جاتا ہے اور عرصہ تک تاریکی میں رہنے کی وجہ سے روشنی سے آنکھیں خیرہ ہونے لگتی ہیں۔

اسلام و ایمان حقیقتاً نام تھا صرف اتحاد امت کا، نفسی و مالی جہاد کا، سعی و عمل کا، مکارم اخلاق کا، سید دافع الادعی کا۔ اور کفر کہتے تھے صرف افتراق امت کو، جہاد سے جی چرانے کو، محنت و کوشش سے منحرف ہونے کو، اصول اخلاق سے ہٹ جانے، اور پاتوں توڑ کر ایک جگہ بیٹھ جانے کو۔ لیکن اب اسلام ہے نام صرف تسبیح و عمامہ کا، جبہ و دستار کا، رسمی نماز ادا کر لینے کا، اور سر منڈا کر رسماً و تقلیداً حرم کے طواف کر لینے کا۔ اسی طرح کفر کا مفہوم یہاں تک وسیع ہو گیا ہے۔ اگر آج میں کسی مولوی سے فلسفۂ عبودیت پر بحث کر کے نماز کی حقیقت دریافت کرنا چاہتا ہوں، تو وہ مجھے کافر، ملحد، فاسق و فاجر کہکر نکال دیتا ہے۔

بہرحال دنیا میں مذہب کی ضرورت یقینی ہے، کیونکہ جامعۂ بشری اس کا محتاج ہے، اخلاق کی تعلیم کے لئے کسی نہ کسی ایسی بنیاد کی ضرورت ہے جو سوسائٹی کے قوانین لوگوں پر عائد کر سکے۔ وہ مذہب اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف اسلام ہے، جس کی آغوش ساری دنیا کے لئے کھلی ہوئی ہے اور جس کی تعلیمات فطری ہر ملک اور ہر زمانہ کے لئے موزوں و مناسب ہو سکتی ہیں۔

اس کے بعد غالباً یہ فیصلہ کرنا دشوار نہیں کہ دنیا میں باجی قوت کونسی ہو سکتی ہے۔ وہ جو اپنی تنگ نظری سے خود اپنے افراد کو بھی علیحدہ کر رہی ہے۔ یا وہ جو ساری دنیا کو دعوت عمل دے کر ایک مرکز پر ایک غرض مشترک کے ساتھ جمع کرنا چاہتی ہے۔

نیاز

# ایک چتا میں دو شعلے

آفتاب غروب نہ ہوا تھا، لیکن آسمان پر اتنا گہرا بادل چھایا ہوا تھا کہ اندھیرا کافی ہو گیا تھا، اور تیز ہوا کی وجہ سے گرد و غبار اٹ گیا تھا جس نے اور بھی رہی سہی روشنی محو کر دی تھی، عین اُسوقت راج کشور اپنی نوعروس کو لئے ہوئے معہ اپنے چند عزیزوں کے کشتی پر دیگھا گھاٹ کی طرف جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہوا تیز ہونے لگی اور دفعتًا اس زور کی آندھی اور بارش شروع ہوئی کہ ملاحوں کے حواس گم ہو گئے اور وہی ہوا جس کا خطرہ تھا یعنی کشتی اُلٹ گئی۔

ایک گھنٹہ کے بعد بادل برس کے نکل گیا۔ ہوا بھی تھم گئی۔ آسمان بالکل صاف ہو گیا۔ چاند چمک رہا تھا اور اسکی نکھری ہوئی شفاف روشنی گنگا کی پر سکوت سطح پر مچل رہی تھی۔ راج کشور کو جب ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو بھیگے ہوئے کپڑوں میں ریت پر پڑا پایا۔ متوحش نگاہوں سے اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ کشتی کا اُلٹنا یاد آتے ہی اُسے چکر سا آ گیا۔ اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ جب اوسان کچھ بجا ہوئے تو بے اختیار اِدھر اُدھر مضطرب ہو کر دیکھنے لگا۔ اس خیال سے کہ معلوم نہیں اُس کے ہمراہیوں کا کیا حشر ہوا؟ اپنے باپ کا جو اس کی ماں کے مرنے کے بعد اس کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ خیال آتے ہی وہ بلبلا کر رونے لگا۔ اسی طرح اُسے اپنی نئی دلہن کا جسے اس نے ابھی دیکھا بھی نہ تھا خیال آیا۔ وحشت میں وہ ادھر ادھر پھر رہا تھا کہ ناگاہ چاندنی میں اُس نے دیکھا کہ کوئی چیز سُرخ کپڑے میں لپٹی ہوئی پڑی ہے۔ وہ امید و بیم کے ساتھ اس طرف بڑھا۔ دیکھا کہ کوئی لڑکی عروسی کے کپڑے پہنے بھیگی ہوئی خوف کے مارے سمٹی جا رہی ہے۔ لڑکی اس کو اپنی طرف آتا دیکھکر اور سہم گئی اور اپنی سُرخ چادر اپنے چاروں طرف لپیٹ لی۔ راج کشور کو یہ سمجھنے میں زیادہ وقت نہیں ہوئی کہ وہ کون ہے۔ وہ بے اختیار بول اُٹھا:-

"پرماتما نے تم کو بھی میری طرح بچا لیا" لڑکی خاموش رہی۔ بلکہ اور سمٹ کر بیٹھ گئی۔ راج کشور نے کہا:-

"میں تمہارا بدنصیب شوہر ہوں۔ اب اس مصیبت میں شرم و حیا فضول ہے۔ تم کو اور لوگوں کی بھی کچھ خبر ہے"

"جی نہیں" لڑکی نے آہستہ سے کہا۔

راج کشور کا جی پھر اُمنڈنے لگا۔ اس جگہ کی مایوس کن تنہائی سے اس کا دم اُلجھ رہا تھا۔ آخرکار وہ رونے لگا۔ اور اتنا رویا کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ لڑکی کے بھی اس سانحہ سے ہوش و حواس صحیح نہ تھے۔ راج کشور کو روتا دیکھکر وہ خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ راج کشور سے نہ رہا گیا۔ اُس نے ایک بے لبسی کے انداز میں اپنی آغوش اُسکے سامنے کر دی۔

اور جب صبح ہوئی تو آفتاب کی سُنہری کرنیں دو معصوم ہستیوں پر پڑ رہی تھیں۔ جو دنیا و مافیہا سے بے خبر چمکتے ہوئے ریت پر غافل پڑی تھیں۔

راج کشور کی آنکھ پہلے کھُلی وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ اپنے ماحول کو محسوس کر کے وہ پھر پریشان ہو گیا۔ اشنان کر کے لڑکی کو بھی جگایا۔ وہ بیچاری بھی اسی طرح بدحواس تھی۔ راج کشور نے اسکو تسلی دی۔ اور پوچھا: "تمہارا نام کیا ہے؟" "کسوم"۔ لڑکی نے آہستہ سے جواب دیا۔ راج کشور "کسوم" کو وہیں چھوڑ کر بہت دور دور تک سر مار آیا۔ لیکن اس کے ہمراہیوں کا نشان نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اس کی مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کسوم کے پاس واپس آکر اپنی ناکامی کا حال بتلایا۔ دونوں پریشان تھے کہ کیا کریں۔ تھوڑی دیر میں دیکھا کہ ایک ملاح اپنی کشتی کھیتا جا رہا ہے۔ راج کشور نے اُسے پکارا جب وہ کنارے آیا تو دونوں کشتی پر سوار ہو گئے اور چند گھنٹوں کے بعد دگھیا گھاٹ پہونچ گئے۔

---

راج کشور کا اب کوئی قریب کا عزیز باقی نہ رہا تھا۔ وہ وکالت کا امتحان پاس کر چکا تھا۔ اس کے باپ کے ایک قدیم ملنے والے منشی برج نرائن پنشنر ہیڈ ماسٹر کلکتہ میں مستقل طور پر رہتے تھے۔ راج کشور نے ان کو اپنے والد کی اچانک موت کی خبر دی مگر شادی کا کوئی تذکرہ نہ کیا۔ اُنھوں نے اس کو کلکتہ بلا لیا۔ اس نے وہیں کرایہ پر ایک مکان لے کر پریکٹس شروع کر دی۔ ذہانت اور سخت جفاکشی کی وجہ سے تھوڑے ہی دنوں میں معقول آمدنی ہونے لگی۔ اب اس نے کسوم کو بھی وہیں بلا لیا۔ لیکن یہ ایک اتفاق تھا کہ بابو برج نرائن سے اس نے اس کو مخفی رکھا۔ چھ مہینے ہنسی خوشی سے گذر گئے کسوم کی صرف یہ کوشش تھی کہ وہ راج کشور کو خوش رکھ سکے۔ راج کشور بھی اس کی بھولی بھالی اداؤں کا جو معصومیت اور اخلاص سے لبریز ہوتی تھیں۔ پہروں مزہ لیا کرتا۔ ایک روز باتوں باتوں میں راج کشور نے پوچھا۔ کسوم تم کو اپنا گھر تو بہت نہیں یاد آتا۔ شادی کے بعد سے وہاں کی کوئی خبر بھی نہیں معلوم ہوئی۔ تم وہاں جانا تو نہیں چاہتیں۔ کسوم مُسکرا کر بولی۔ میرا وہاں کون ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جب میں بہت کمسن تھی تو گاؤں میں ایک نہایت خوفناک طاعون پھیلا۔ اور اسی میں مبتلا ہو کر میرے ماں باپ دونوں مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ اس کے بعد پنڈت جی مہراج نے جو میرے پڑوس میں رہتے تھے مجھے اپنے پاس رکھا۔ پھر اب تک جیسی گذری اس کے خیال سے جی کانپنے لگتا ہے۔ گھر میں ہر شخص ذلیل نگاہ سے دیکھتا تھا۔ پنڈت جی کی بیوی اور لڑکیاں مجھ سے بہت بُری طرح پیش آتی تھیں۔ مہراج میرا خیال کرتے تھے۔ لیکن وہ باہر کے آدمی ان کو کیا معلوم کہ گھر کے اندر کیا ہوتا ہے۔ تم نے دیکھا تھا کہ شادی کس بے ترتیبی سے ہوئی۔

کسوم کی زبان سے یہ باتیں سُن کر راج کشور کے کان کھڑے ہوئے۔ اُس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ جس لڑکی سے اُس کی شادی ہوئی تھی اُس کے ماموں جل گاؤں کے کاشتکار تھے اور وہی اُس کے سرپرست تھے۔ اُس نے گھبرا کر پوچھا "تمہارے گاؤں کا نام کیا تھا؟" "اب کیا تم کو اتنا بھی یاد نہیں۔" کسوم راج کشور کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی۔ "شادی سے

پہلے آخر تم بھی تو ایک ہفتہ اپنے دوست کے یہاں ٹھہرے تھے۔ کیا کرن پور تھیں یاد نہیں رہا" راج کشور سخت پریشان ہو گیا۔ کچھ اور گفتگو کے بعد اسے قطعی طور پر یہ معلوم ہو گیا۔ کہ کسوم وہ لڑکی نہیں۔ جس کے ساتھ جل گاؤں میں اس کا بیاہ ہوا تھا۔ لیکن اس نے اس کا اظہار کسی طرح کسوم پر نہ ہونے دیا۔ وہ پریشان تھا کہ کیا کرے۔ یہ بات نہایت نازک تھی۔ کسوم کے اصلی شوہر نہ ہونے کی حیثیت سے ازدواجی تعلقات قائم رکھنا راج کشور ہرگز گوارا نہ کر سکتا تھا۔ اور نہ یہ کسی طرح ممکن تھا کہ کسوم کو جس کا کوئی پرسان حال نہ تھا بے یار و مددگار چھوڑ دے۔

---

راج کشور جب سے کلکتہ آیا تھا۔ اپنے پیشہ میں بہت منہمک تھا۔ لیکن فرصت کے وقت وہ کبھی کبھی منشی برج زائن کے یہاں بھی ہو آتا تھا۔ اور جب سے کسوم کا اصلی حال معلوم ہوا تھا۔ برج زائن کے یہاں اسے ایک نئی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

کنول برج زائن کی تنہا اولاد تھی۔ اور جب سے ان کا جوان لڑکا مر چکا تھا۔ اُن کی تمام امیدیں صرف کنول کی خوشی سے وابستہ تھیں۔ کنول نے سال گزشتہ ایف۔ اے درجہ اول میں پاس کیا تھا۔ اور اس تعلیم نے کنول میں ایک مغربی رنگ پیدا کر کے اس کے اچھوتے حسن کو اپنی جگہ پر مکمل کر دیا تھا۔ کنول جب اپنے بالوں میں متعدد جگہ نشیب و فراز پیدا کر کے ان کو سنوارتی۔ اپنی باریک ساری جس میں سے اُس کے کندن جیسے بدن کی روشنی چھنتی تھی زیب تن کرتی۔ اپنے خوشنما انگریزی وضع کے جوتے پہنتی۔ اور اس طرح جب وہ اپنی بغل میں کتاب دبائے۔ اسکول کی گاڑی کی طرف جو روز صبح کے وقت سڑک پر اس کا انتظار کرتی تھی چلتی تو صدہا نگاہیں بے اختیار بچھ جاتیں اور وہ ایک فاتحانہ استغنا سے جلدی جلدی چل کر گاڑی میں ہو لیتی۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک مخلوق اپنی حسرتیں اس کے پاؤں کے نیچے ڈال دے اور وہ اُنھیں ہنس کر لاپرواہی سے ٹھکرا دے۔ اگر وہ کسی ایسے مرد کو دیکھتی جس کی نظروں میں اس کو دیکھ کر التجا کا رنگ نہ آ جاتا۔ تو اس کے حسن کو ایک ناقابل برداشت ٹھیس لگتی۔ راج کشور کا روز روز کا آنا جانا رنگ لا کر رہا۔ اس کی سنجیدہ طبیعت، اس کی شائستہ گفتگو اور پھر اسکی رعنائی۔ یہ سب باتیں ایسی نہ تھیں کہ کنول اس سے متاثر نہ ہوتی۔ راج کشور بھی کنول کے اس احساس کو سمجھ گیا تھا اور سمجھ کر خوش تھا، کنول کی نکتہ سنجی، اس کی ذہانت، اس کی اعلےٰ تعلیم اور اس تعلیم کے اثر سے اس کی اداؤں کی دلفریبی ایسی باتیں نہ تھیں کہ راج کشور داد نہ دیتا۔ اس کو اس کا قلق تھا کہ کسوم اس کے عمیق حیات کے مطالعہ سے قطعی نابلد ہے۔ اور اسکی فراست و ذہانت کو نہ سمجھ سکتی ہے اور نہ داد دے سکتی ہے۔ یہ تھی وہ اُرکاوٹ جو کسوم کا حال معلوم ہونے کے بعد اس میں اور راج کشور میں پیدا ہو گئی تھی۔ برج زائن صاحب کے کہنے سے کنول اپنے درس فلسفہ کا کوئی مسئلہ جس میں اُس کو کچھ شبہ ہوتا۔ راج کشور کے سامنے لاتی اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ راج کشور کی ذرا سی تنقید سے اس کی پوری تشفی نہ ہوئی ہو راج کشور کا یہ معمول ہو گیا کہ بلاناغہ شام کی چائے برج زائن صاحب کے یہاں پیا کرتا۔ اتفاق سے اگر راج کشور کو دیر ہو جاتی

تو کنول کو الجھن ہونے لگتی۔ اور وہ اگر اسی درمیان میں آجاتا تو کنول خوشی سے اُچھل پڑتی۔ اس کا چہرہ چمکنے لگتا۔ اور راجکشور کو اس انتظار کرانے کے جرمانہ میں ایک پیالی چائے زیادہ پینی پڑتی۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس کو اس پیالی میں سرور محسوس نہ ہوتا تھا۔

---

راج کشور جب گھر آتا تو پریشان رہتا۔ اس کی جان عجیب کشمکش میں تھی۔ کسوم اس تغیر کی وجہ بالکل نہ سمجھی۔ راج کشور کے اگلے التفات کے لئے وہ ترسا کرتی۔ پہروں بیٹھی سوچا کرتی کہ آخر اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں خاک نہ آتا۔ ایک روز راج کشور نے کہا:۔

"کسوم میں دن بھر کچہری میں رہتا ہوں۔ تمہاری طبیعت نہیں گھبراتی۔ تمہیں پڑھنے کا شوق نہیں؟"

"اچھا مجھے پڑھائیے" کسوم نے لجاتے ہوئے کہا۔

"تم خود دیکھتی ہو کہ مجھے کہاں فرصت رہتی ہے؟ دن بھر موکلوں میں پھنسا رہتا ہوں۔ میں تمہارا داخلہ کسی سکول میں کرا دوں"

"میں اسکول میں پڑھوں گی۔ مجھ سے اتنی لڑکیوں کے بیچ میں کیسے جایا جائے گا؟"

راج کشور کا لہجہ اب زیادہ سنجیدہ تھا۔ اور کیوں اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ دیکھو بڑے بڑے شریفوں کی لڑکیاں اسکول پڑھنے جاتی ہیں۔ چار لڑکیوں کے ساتھ رہو گی، تو بہت سی اچھی باتیں آپ سے آپ آجائیں گی۔ کسوم! علم بڑی دولت ہے۔ بغیر علم کے آدمی نہ تو اپنا بُرا بھلا سمجھتا ہے اور نہ اپنے پرماتما کو پہچان سکتا ہے۔ میں تمہارا داخلہ اسکول میں کرا دوں اور تم وہیں بورڈنگ میں رہا کرنا۔ بغیر بورڈنگ میں رہے آدمی کی تعلیم مکمل نہیں ہوتی۔ کیوں تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟

"جیسی آپ کی مرضی" کسوم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ لیکن جب راج کشور باہر چلا گیا تو اس خیال سے کہ اسے بورڈنگ میں راج کشور سے بالکل علحدہ رہنا پڑے گا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

چھ مہینے کسوم کو اسکول میں پڑھتے ہوئے ہو گئے۔ اس درمیان میں راج کشور اس کے پاس صرف دو مرتبہ گیا۔ وہ بھی اس کی فیس وغیرہ جمع کرنے کے لئے اور ان میں جو گفتگو ہوئی وہ صرف کسوم کی تعلیم کے متعلق۔ کسوم آخر کب تک سینہ پر سل رکھ کر اپنے دل کو بہلاتی۔ اس کا ننھا سا دل اس سخت امتحان کے لئے تخلیق ہی نہیں ہوا تھا۔ آخر وہ کمرہ بند کر کے اپنی موجودہ حالت پر بیٹھی غور کیا کرتی۔ اکثر اس کا الھڑ پنا غالب آتا اور وہ یہ سوچ کر اپنا دل بہلا لیتی کہ راج کشور مجھ سے میری جہالت کی وجہ سے برگشتہ رہتا ہے۔ اب گرمیوں کی تعطیل میں، میں خوب پڑھ کر اس کے پاس جاؤں گی۔ تو وہ پہلے کی طرح مجھ سے پھر خوش رہا کرے گا۔ اس خیال سے وہ خوب جی لگا کر پڑھنے لگی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سالانہ امتحان میں اسکو دو درجوں کی ترقی دی گئی۔ دو چار روز کی تعطیل جب ہوتی تو اس کی ہمجولیاں اس کو چھیڑتیں۔ کہ تم اپنے گھر کیوں نہیں جاتیں؟

وکیل صاحب تم کو بلاتے کیوں نہیں۔ کسوم یہ کہکر ان کو ٹالدیتی:-
"میں خود نہیں جاتی۔ کتابوں میں جو مجھے لطف آتا ہے وہ کہیں نہیں آتا۔" اس پر لڑکیاں اسے بہت دق کرتیں۔ ان کے سامنے تو وہ بہ ظاہر بہت خوش رہتی۔ لیکن اس کے دل میں نہایت ہی تکلیف دہ خلش پیدا ہوتی۔ اور جب وہ تنہا رہجاتی تو خدا معلوم کیسے کیسے وہم اس کے دل میں گزرتے۔

گرمیوں کی تعطیل کو صرف دو ہفتہ رہ گئے ہیں۔ ساری لڑکیاں گھر جانے کی خوشی میں پھولی نہیں سماتیں۔ کسوم نے بیٹھے بیٹھے ایک خط راج کشور کے نام لکھکر ڈالا۔

پران ناتھ!

ڈرتی ہوں کہ آپ میری اس ہمت پر ناراض نہ ہوجائیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ آپ میرے ہاتھ کا خط دیکھکر خوش بھی ہوں گے۔ لڑکیوں نے اپنے بھائی بہنوں کے لئے کروشیا کے بہت سے تحفے تیار کئے ہیں، میں نے بھی آپ کے لئے بہت سی اچھی اچھی چیزیں بنائی ہیں۔ جب آؤں گی تو آپ کے قدموں پر رکھوں گی۔ آپ میرے لئے خرچ بہت زیادہ بھیجتے تھے۔ میں نے اس میں سے بہت سا روپیہ جمع کرلیا ہے۔ لیکن اس کو میں آپکو واپس نہ دوں گی۔ میں نے انکے لئے ایک بہت اچھا استعمال سوچا ہے۔ جب آپ ملیں گے تو بتاؤں گی۔

آپ کی داسی

---

راج کشور برج نرائن کے یہاں سے واپس ہی ہوا تھا کہ ڈاکیہ نے اس کو کسوم کا خط لاکر دیا۔ پڑھکر اسے واقعی خوشی ہوئی۔ لیکن رنج بھی کم نہ ہوا۔ اس کو اپنے اندر ایک کھٹک محسوس ہوئی جس میں لطف کا ایک پہلو ضرور تھا۔ لیکن کلفتیں زیادہ تھیں۔ جس قدر اس نے سوچا۔ گتھیاں زیادہ پڑتی گئیں۔ پریشان ہوکر وہ کمرہ میں ٹہلنے لگا۔ آخرکار وہ گھر سے نکلا اور اسکول کی طرف چلدیا۔ راستہ میں کئی دفعہ اس کے پاؤں نے اس کو جواب دیدیا۔ اس کے تمام جسم میں ایک کپکپی سی پیدا ہونے لگی۔ اور وہ ٹھٹکا کہ گھر واپس جائے۔ لیکن وہ طاقت جو اسکول پہنچانا چاہتی تھی۔ غالب آئی اور وہ اسکول کے احاطہ میں داخل ہوکر سیدھا ہیڈ مسٹرس کے دفتر میں پہونچا۔ اور ملاقاتی کارڈ بھیجکر باہر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کو دور سے چند لڑکیاں اسکول سے بورڈنگ کی طرف جاتی دکھائی دیں۔ اس نے دیکھا کہ ان میں ایک کسوم ہے۔

راج کشور کی عجیب حالت تھی۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ سینہ زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ آخرکار راج کشور نے اس خیال سے کہ کسوم اس کو پہچان نہ لے اپنے منہ پر رومال ڈال لیا۔ اتنے میں آدمی نے آکر کہا کہ ہیڈ مسٹرس آپ کو سلام کہتی ہیں۔

راج کشور ہیڈ ماسٹرس کے دفتر میں اپنی حالت سنبھال کر پہنچا۔

"میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟" ہیڈ مسٹرس نے کہا۔

"کسوم کو میں گرمیوں کی تعطیل بھر آپ کی زیر نگرانی بورڈنگ ہی میں رکھنا چاہتا ہوں۔" راج کشور نے رُک رُک کر کہا۔

"تعطیل میں سب لڑکیاں اپنے گھر چلی جائیں گی۔ پڑھائی بھی بند ہو جائے گی۔ کسوم یہاں بیکار۔ تنہا کیسے رہے گی۔ اس کے علاوہ آپ کو یہ کیونکر گوارا ہوگا کہ سال بھر کے بعد تعطیل میں بھی وہ آپ سے علیحدہ رہے۔"

"کیا کروں؟ کچھ مجبوریاں اسوقت ایسی ہیں کہ اور کوئی چارہ نہیں۔"

"اچھا جیسی آپ کی مرضی۔ میں کسوم کے متعلق ضروری انتظام کر دوں گی۔"

اس کے بعد راج کشور گھر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ برج نرائن صاحب کا آدمی آیا تھا۔

راج کشور کو اول تو ان الجھنوں نے بہت زیادہ پریشان کر رکھا تھا۔ دوسرے وہ تھک بھی بہت گیا تھا۔ اس نے خیال کیا کہ اس وقت وہاں نہ جائے۔ لیکن یک بیک اسے وحشت سی ہونے لگی۔ اور بغیر کسی ارادہ کے گھر سے نکل پڑا۔ اس نے غور کرنا چاہا کہ وہ آخر کیوں اس درجہ بدحواس ہے۔ لیکن دماغ اس کو جواب دے رہا تھا۔

برج نرائن صاحب باہر بیٹھے ہوئے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کو دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ بولے "راج کشور آج تم نے بڑی راہ دکھائی۔ ہم لوگ کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ کنول کو آج حرارت ہے۔" راج کشور خاموش دیوار کی آڑ لئے کھڑا رہا۔ برج نرائن کی سمجھ میں نہ آیا کہ خلاف معمول یہ حالت راج کشور کی کیوں ہے؟ پوچھا "کیوں تم آج ایسے متوحش کیوں نظر آتے ہو۔ اندر چلو۔ تم ایسے کھڑے ہو جیسے کچھ سُنا ہی نہیں۔" راج کشور چونک پڑا اور بولا "کوئی خاص بات نہیں۔ طبیعت ذرا آج بھاری ہے۔ چلئے اندر تشریف لے چلئے۔" کنول۔ ایک مسہری پر پڑی تھی۔ ان لوگوں کو آتا دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔ برج نرائن نے پوچھا "کیسی طبیعت ہے۔ ٹمپریچر کیا ہے؟" کنول کا چہرہ بخار کی گرمی سے تمتمایا ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ گالوں کی گلابی رنگت تپ کی گرمی سے ایک دل آویز سرخی میں تبدیل ہو گئی تھی اور بالوں سے چھپی ہوئی فراخ پیشانی پر کہیں کہیں پسینہ کے قطرے چمک رہے تھے۔ معمولی مزاج پرسی کے بعد راجکشور ایک کرسی لے کر بیٹھ گیا۔ کنول کو تعجب تھا کہ وہ کیوں اس قدر خاموش اور کھویا ہوا سا ہے۔ کچھ دیر تک ادھر ادھر کی گفتگو رہی۔ رات چونکہ کافی گذر چکی تھی۔ راج کشور عذر کر کے گھر واپس آیا۔ کھانا نہیں کھایا۔ اور کپڑے اُتار کر لیٹ گیا۔

اُسوقت دو تصویریں سامنے نظر آ رہی تھیں۔ ایک کسوم کی تھی۔ دوسری کنول کی۔ اور اس خیال سے کہ وہ کسے چھوڑے اسے اختلاج ہونے لگا تھا۔ ایک طرف کنول کی ادائیں۔ اس کے خوبصورت خدوخال۔ اس کی آنکھوں کی متھا طیسی شراب دوسری طرف کسوم کی خیالی تصویر نظریں جھکائے ملتجی تھی کہ "مجھے اپنے اوپر سے نثار ہو جانے کی اجازت دو۔" اس کی نگاہوں میں سرور تھا۔ لیکن ان سے ایک پاکیزہ شفاف روشنی چھن رہی تھی۔ اس کی فراخ پیشانی آرائشوں سے بری تھی۔ لیکن

اس کے خوبصورت بالوں کا فطری تموج احساسات میں ایک جذبۂ شوق پیدا کر رہا تھا۔ وہ مسکرا نہیں رہی تھی۔ لیکن اُسکے گلابی ہونٹ ایک دوسرے سے کچھ ایسی نرمی سے متصل تھے کہ معلوم ہوتا تھا وہ اب کھِل کھلا کر ہنسنے ہی والی ہے۔

راج کشور کو کسی فیصلہ پر پہونچنا سخت دشوار تھا۔ ایک سخت اضطراب کی حالت میں کروٹیں لیتا رہا اور دیر تک اسے نیند نہ آئی۔

---

راج کشور کی جب آنکھ کھُلی تو کافی دن چڑھ آیا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانیوں کے بجائے ایک خود فراموشی کا رنگ تھا۔ شاید شب کی کاوشوں کے بعد راج کشور کسی فیصلہ پر پہونچ گیا تھا۔ چائے پی کر بیج نرائن صاحب کے یہاں پہونچا۔ کنول کی حالت بدستور تھی۔ بلکہ تپ اور شدید ہو گئی تھی۔ آج اتوار ہونے کی وجہ سے وہ کچہری بھی نہیں گیا، اور دن بھر نہایت انہماک سے کنول کی تیمارداری میں مصروف رہا۔ ڈاکٹر نے ہر دو گھنٹے کے بعد دوا پلانے کے لئے کہا تھا۔ راج کشور ہمہ تن اضطراب بنا ہوا گھڑی کی ٹک ٹک پر کان لگائے ہوئے بیٹھا تھا۔ جب بڑی سوئی بارہ کے قریب ہوتی تو وہ لڑکھڑاتے ہوئے پاؤں سے اُٹھتا۔ غلبۂ شوق سے اُس پر ایک سخت ارتعاش طاری ہوتا۔ اور وہ اسی طرح کانپتا ہوا کہہ اُٹھتا: "کنول دوا پی لو۔" کنول دو روز کے بخار سے بہت نحیف ہو گئی تھی۔ اس لئے اس کو اُٹھانے میں راج کشور کی مدد کی ضرورت پڑتی۔ جس کے بعد دوا کا چمچہ راج کشور اُس کے منھ کے سامنے کر دیتا اور وہ اُسے آنکھ بند کر کے پی جاتی۔ آیا کنول واقعی اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ بغیر راج کشور کی مدد کے نہ اُٹھ سکتی۔ اور اپنی نیم باز آنکھوں سے گھڑی کی طرف صرف اس لئے دیکھتی تھی کہ اسکو وقت پر دوا پینے کا بہت خیال تھا۔ اس پر تنقید کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ دوا پی لینے کے بعد اپنی مدھ بھری آنکھیں راج کشور کی طرف متشکرانہ انداز سے پھیر دیتی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ راج کشور اس مقابلہ کی تاب لا سکتا تھا۔ وہ ایک غیر محسوس سوز سے پھُکنے لگتا اور یہ محسوس کرتا کہ اس کی روح کو کنول کی آنکھوں کے گلابی ڈورے اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ جذبات کی ان کشاکش میں دو بیتاب ہستیاں پھر گھڑی کی طرف متوجہ ہو کر دوسرے گھنٹے کے انتظار میں کھو جاتیں۔

راج کشور کے رات دن کا حصہ کنول کی تیمارداری میں صرف ہونے لگا۔ کام پر بھی وہ برائے نام ہی جاتا لیکن ایک ماہ گذر گیا اور کنول کی طبیعت روبہ اصلاح نہ ہوئی۔ جوں جوں کنول کی علالت پیچیدہ ہوتی جاتی تھی۔ راج کشور کا دل اس خیال سے بیٹھا جاتا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ ایک روز کچہری سے واپس آکر وہ کمرہ کے اندر اسی اودھیڑ بن میں بیٹھا تھا کہ دروازہ کے سامنے زنانہ اسکول کی گاڑی آئی اور ہیڈ مسٹرس معہ کسوم کے اُس میں سے اُتری۔ راج کشور نے جو نظر اُٹھائی تو اسے سکتہ سا ہو گیا۔ اُس نے اپنی گھبراہٹ کو حتی الوسع چھپاتے ہوئے نہایت تپاک سے ہیڈ مسٹرس کو سلام کیا۔ معمولی مزاج پرسی کے بعد ہیڈ مسٹرس نے ایک سنجیدگی سے جس میں ذرا ترشی ضرور ملی تھی۔ راج کشور سے بولیں: "میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ تعطیل میں تمام لڑکیاں اپنے گھر چلی جاتی ہیں۔ اور اس حالت میں کسوم کو اکیلے رہنے میں بڑی مصیبت کا سامنا ہو گا۔

چنانچہ اسکول میں تعطیل ہو گئی ہے۔ اور جب وقت سے کسوم کو یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ تعطیل میں بھی وہیں رہے گی برابر رو رہی ہے۔ اس لئے کوئی چارہ نہ تھا بجز اسکے کہ آپ کے پاس پہنچا دیا جائے"۔ راج کشور نے بہ ہزار دقت اپنے حواس اکٹھا کر کے کچھ منتشر الفاظ میں ہیڈ مسٹرس کا شکریہ ادا کیا اور وہ اسکول واپس گئیں۔

روتے روتے کسوم کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ اس کے بال پریشان تھے۔ اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا لیکن بایں ہمہ کسوم اب وہ کسوم نہ تھی جو ایک سال پہلے اسکول میں داخل ہونے کے وقت تھی۔ اسکول کی لڑکیوں کی صحبت اور تعلیم کے اثر سے اسکی نشست و برخاست میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا تھا۔ اس کی وضع اس کی گفتگو، اس کی سفاک سنجیدگی جس میں اس کے فطری البیلے پن کی جھلک اب بھی موجود تھی۔ ان باتوں نے اگر راج کشور کو کچھ دیر کے لئے حیرت میں ڈال دیا تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کسوم نے کس قدر جلد اسکول اور تعلیم کا اچھا اثر قبول کر لیا۔ لیکن کسوم کی فطری سادگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی اور اب بھی وہ حجابِ عصمت کی پتلی تھی۔

راج کشور ہمت کر کے بولا:۔ "کسوم میں نے تم کو بورڈنگ میں چھوڑ دینے کا اس لئے ارادہ کیا تھا کہ ایک تو میرا ارادہ کچھ دنوں کے لئے نینی تال جانے کا ہے۔ دوسرے مجھے یہ خیال ہوا کہ تعطیل میں تم ہیڈ مسٹرس کے ساتھ رہ کر اپنی تعلیم میں خوب ترقی کر سکو گی۔ تم اس قدر پریشان کیوں ہو گئیں؟"

کسوم کچھ دیر چپ رہنے کے بعد آہستہ سے بولی:۔ "گنہگار ہوں"۔ یہ کہنے کے بعد بڑے بڑے موتی آہستہ آہستہ اُسکی آنکھوں سے ٹپکنے لگے۔ راج کشور نے اسے بہت سمجھایا، تسلی دی، اسکول کے حالات پوچھے، کچھ سبق وغیرہ سُنا اور شام کو ٹہلنے کا بہانہ کر کے باہر چلا گیا۔ کسوم کا دل شک کرنے کے لئے تخلیق ہی نہیں ہوا تھا۔ راج کشور کے تسلی دینے سے اسے اطمینان ہو گیا اور وہ خوش ہو گئی۔ راج کشور جب رات کو برج رانی کے یہاں سے واپس آیا تو کسوم نے خوشی خوشی اپنی دستکاری کے نمونے راج کشور کو دکھلائے۔ اسی طرح ایک ہفتہ گذر گیا۔ لیکن راج کشور صبح کا گیا ہوا سہ پہر کو آتا۔ اور شام کو جاتا تو بہت رات گئے واپس ہوتا۔ کسوم کب تک دل کو مغالطہ دے کر خاموش رہتی۔ آخر انسان تھی۔ اور اس سے قبل معلوم نہیں کتنے صدمے اُٹھا چکی تھی۔ راج کشور کسوم کی معصوم باتوں کی طرف مائل ہونا چاہتا تھا۔ لیکن کنول کا خیال اس کو ایک لمحہ کے لئے نہ چھوڑتا تھا۔ اب پھر وہ کسوم کی طرف سے لاپرواہ رہنے لگا۔ اور وہ اس کی باتوں کے لطف سے محروم رہنے لگی۔ وہ بھی کب تک اپنے آپ کو غلط فہمی میں مبتلا رکھتی۔ آخر کار اس کو ایک جانسوز خلش، ایک جلا دینے والی سوزش بیتاب رکھنے لگی۔ وہ پھر دل اُداس بیٹھی رہتی۔

---

کنول کی حالت دن بدن ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ راج کشور پر کنول کے عشق کا جنون پوری قوت کے ساتھ مسلط تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ کسوم سے فی الحال پیچھا چھڑا لینا چاہیئے۔ کیونکہ اُس کے بغیر کنول کی تیمارداری یکسوئی کے

ساتھ نہیں ہو سکتی۔ بکسر میں اس کے ایک ملاقاتی تھے۔ اس نے ان کو ایک بار گی لکھ دیا کہ میں فلاں روز آرہا ہوں اور کسوم کو کچھ دنوں کے لئے تمہارے یہاں چھوڑ جاؤں گا۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا۔ کسوم سے اس نے ایک مقدمہ کے سلسلے میں باہر جانے کا بہانہ کرتے ہوئے کہا کہ تمہارا یہاں اتنے بڑے شہر میں تنہا رہنا مناسب نہیں۔ میں تم کو بکسر میں اپنے ایک دوست کے مکان پر پہونچا آؤنگا۔ ان کی بی بی بہت خوش اخلاق ہیں۔ تمہاری طبیعت بہل جائے گی۔ اور پھر ایک ماہ کے اندر آ کر میں تمہیں واپس لے آؤں گا۔

کسوم کا دل تو ٹھیک ہی رہا تھا۔ اس نے کہا "جیسی آپ کی خوشی"۔ چنانچہ اُسکے تیسرے روز راج کشور مع کسوم کے بکسر بابو نولکشور کے یہاں پہنچ گیا۔ نولکشور نہایت سادہ مزاج شریف انسان تھے۔ راج کشور کے ساتھ وکالت پاس کی تھی۔ اسی پیشہ سے دال روٹی پیدا کر کے عزت و آبرو سے زندگی گذار رہے تھے۔ راج کشور کے آنے سے بہت خوش ہوئے راج کشور نے جب واپس جانے کا ارادہ کیا تو نول کشور صاحب نے قسم کھا کر کہدیا کہ ایک ہفتہ تک وہ کوئی ایسی بات نہیں سنیں گے۔ راج کشور نہایت گھبرایا۔ کسوم کی خدمت سے ایک ہفتہ کی غیر حاضری ایک ایسی بات تھی کہ راج کشور گھبرا گیا۔ اور اس کی پریشانی اس حد تک پہونچ گئی کہ نولکشور بھی بغیر کہے ہوئے نہ رہ سکے کہ "راج کشور یہ آخر تمہاری کیا حالت ہے"؟ راج کشور نے لاکھ ہاتھ پاؤں مارے مگر نول کشور نے ایک نہ سُنی۔ راج کشور نے یہ ہفتہ کسی طرح گذارا۔ یہ اسی کا دل جانتا تھا۔ ایک روز بیٹھے بیٹھے اس نے سوچا کہ تمام جھگڑا ہی نہ پاک کر دیا جائے۔ یہ طے کر کے وہ خط لکھنے بیٹھ گیا:-

"پیاری کسوم!

مجھے نہیں معلوم کہ مجھ کو تمہیں اس طرح خطاب کرنے کا کہاں تک حق حاصل ہے؟ تم کو میری کشیدگی سے تکلیف ہوتی ہوگی۔ اور جس غلط فہمی میں تم قدرت کی ستم ظریفی سے مبتلا ہو۔ اس لحاظ سے تم کو جو شکایت بھی میری جانب سے ہو بجا ہے۔ مجھے خود تعجب ہے کہ آخر میں نے تم کو کیوں ابتک حقیقت سے نا آشنا رکھا۔ تم کو شاید یاد ہوگا کہ ہماری باہمی علیحدگی کی وہ تاریخ ہے۔ جب میں نے تم سے تمہارے میکے کے متعلق کچھ سوالات کئے تھے۔ مگر اس انکشاف سے صدمہ ضرور ہوگا اور ایسا شدید جس کا برداشت کرنا تمہارے لئے سخت دشوار ہوگا۔ لیکن اب مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ تم کو واقعات سے آگاہ کر دیا جائے۔ لو کسوم میں وہ کہے دیتا ہوں جس کے کہنے کی ابتک نہ تاب تھی نہ ہمت۔ سنو! اُس روز کی باتوں سے مجھے یہ معلوم کر کے ایک خفقان سا ہونے لگا کہ تم میری بیوی نہیں ہو۔ میری اور تمہاری دونوں کی کشتی غالباً طوفان سے اُلٹ گئی تھی۔ اور چونکہ نہ میں نے اپنی بیوی کی شکل دیکھی تھی اور نہ تم نے اپنے شوہر کی۔ ہم لوگوں کو یہ سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی کہ ہم ایک دوسرے کے رفیق زندگی ہیں۔ لیکن تم نے جو واقعات بتلائے اُنھوں نے مجھے سراسیمہ کر دیا غالباً میری کشتی سے میری بیاہی ہوئی بیوی اور تمہاری کشتی سے تمہارے شوہر دونوں مع تمام لوگوں کے غرق ہو گئے۔ ان واقعات کو معلوم کر کے تم کو مجھ سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ مجھے اپنا ہر حال میں ہمدرد سمجھو۔ میں تم کو دنیا میں بے یار و مددگار

نہیں چھوڑ سکتا۔ میں خود تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اب کیا ہو؟

تمہارا مخلص
راج کشور

خط لکھنے کو تو لکھ گیا لیکن راج کشور کسوم کی طبیعت سے خوب واقف تھا وہ جانتا تھا کہ وہ اس خط کو پڑھتے ہی سر پر خاک ڈال کر کہیں نکل جائے گی۔ اور دوبارہ صورت دکھانا اسکی غیرت ہرگز گوارا نہ کرے گی۔ راج کشور کنول کی رعنائیوں میں کچھ اس طرح پھنسا ہوا تھا۔ کہ اس کو شاید اس کی بھی پرواہ نہ ہوتی۔ لیکن کنول کی علالت اگر خوفناک نہیں تو کم از کم اندیشہ کی حالت تک تو پہنچ ہی گئی تھی۔ یہ سوچ کر وہ کانپ اُٹھتا تھا کہ اگر کنول جانبر نہ ہو سکی تو پھر کیا ہوگا؟ اس خیال کے ساتھ وہ وہ اپنے تمام جسم میں ایک ہلاکت کن کپکپی محسوس کرنے لگتا۔ اور تمام دنیا اس کو تاریک نظر آتی۔ ہاں اس حالت میں کسوم کے خیال سے اُسے تسکین نہیں تو کم از کم ایک خفیف سی گرمی تو آ ہی جاتی تھی۔

کسوم پھر بھی وہی کسوم تھی۔ جسکی ایک ایک ادا پر راج کشور قربان ہوا کرتا تھا۔ جب وہ پھولوں کا ہار بنا کر اسے پہناتی اور محبت سے اس کا سر اپنی آغوش میں لے لیتی تو اسے یہ معلوم ہوا کرتا تھا کہ مقصد حیات کی انتہا یہی ہے۔ اس کی معصوم نگاہیں۔ اسکی جان بخش ادائیں۔ اس کی معصوم مسکراہٹ۔ یہ ایسی باتیں نہ تھیں کہ ایک انسان کی حسیات کو متاثر نہ کر دیتیں اور واقعہ یہ ہے کہ کسوم اور کنول میں وہی فرق تھا جو چاندنی کی روح افزا خنکی اور آفتاب کی گرم کرنوں میں ہوتا ہے۔

ان خیالات میں کھویا ہوا راج کشور معلوم نہیں کبتک سر مارا کرتا کہ ملازم نے آ کر کہا کہ کھانے پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ راج کشور گھبرا کر اُٹھا۔ اُس نے یہ طے کر لیا کہ فی الحال کسوم کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور واقعہ سے وہ بدستور بےخبر رہے۔ اس خیال سے اُس نے اس خط کو مروڑ کر دیوار کی ایک دراز میں ڈالدیا۔ اور ایک ہفتہ بھر رہ کر کلکتہ واپس چلا گیا۔

---

بکسر جاتے وقت راج کشور نے برج نرائن سے یہ کہلا دیا تھا کہ ایک سخت ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں، دو روز کی معذرت چاہتا ہوں اور کنول یہ سُن کر سرد پڑ گئی تھی۔ راج کشور کی وجہ سے اس کو اپنی علالت کا بہت کم احساس ہوتا تھا۔ اور اب یہ معلوم کر کے کہ دو روز تک راج کشور نہیں آئے گا۔ اس کو خفقان سا ہونے لگا۔ وہ رات بھر شدید [illegible] میں پڑی رہی۔ برج نرائن کی یہ حالت تھی کہ رات میں کئی بار رو رو پڑے۔ صبح کچھ حالت سنبھلی۔ کنول کی بیماری کی خبر سُن کر اسکی پُرانی ہیڈ مسٹرس اسکو دیکھنے آئیں۔ کچھ دیر تک تاسف کرتی رہیں۔ پھر باتوں باتوں میں بولیں: "کنول مجھے تو تمہاری علالت کی خبر صرف کل شام کو معلوم ہوئی۔ ابھی چند روز ہوئے کہ میں بابو راج کشور کے یہاں جا رہی تھی۔ تمہارے [illegible] مکان کے سامنے سے گذری۔ لیکن کیا معلوم تھا، خیال ہوا کہ رُک کر ملاقات ہی کر لوں لیکن کام جلدی کا تھا۔ علاوہ اسکے راج کشور کی بی بی بھی میرے ساتھ تھیں۔ کنول چونک گئی۔ گھبرا کر پوچھا: "آپ کس راج کشور کا ذکر کر رہی ہیں" انہوں

نے کہا:۔ "وہی راج کشور بابو وکیل جو یہاں سے تھوڑی دور رہتے ہیں۔ یہیں ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتے ہیں۔ ان کی بی بی میرے اسکول میں پڑھتی تھیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ تعطیل میں اس کو بورڈنگ ہی میں رکھیں۔ لیکن لڑکی اس بُری طرح پریشان ہوئی کہ مجبورًا اسکو راج کشور بابو کے پاس پہنچا آئی۔" کنول کی یہ حالت تھی جیسے کسی نے اُس کے سینہ پر زور سے گھونسہ مار دیا ہو۔ اُس نے لاکھ سنبھلنے کی کوشش کی۔ لیکن ایک تو کمزور تھی، پھر اُس پر اتنی سخت چوٹ۔ وہ بیہوش ہو گئی۔ ہیڈ مسٹرس گھبرا گئیں۔ برج نرائن کو پکارا وہ بیچارے یوں ہی بدحواس تھے۔ کنول کی یہ حالت دیکھکر اور بھی ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

ہیڈ مسٹرس نے کہا:۔ "میرے ایک ملاقاتی ڈاکٹر شیام نرائن ہیں، جنھوں نے یہیں سے ڈاکٹری پاس کی ہے۔ اور کچھ دنوں سے بنارس میں پریکٹس کرتے ہیں۔ آج کل یہاں بغرض تفریح آئے ہوئے ہیں۔ نہایت ہوشیار آدمی ہیں اور اخلاق نہایت اچھا ہے۔ میں ان کو بلا لاؤں۔ کنول کا علاج وہی کریں گے۔ آپ کو بہت جلد فائدہ محسوس ہوگا۔"

برج نرائن بابو نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ "میرے تو ہوش بجا نہیں ہیں۔ آپ جو مناسب سمجھئے کیجئے۔"

ہیڈ مسٹرس گھنٹہ بھر کے بعد ڈاکٹر شیام نرائن کو لیکے آئیں۔ شیام نرائن صاحب ابھی نوجوان آدمی تھے۔ ان کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں اور چوڑی پیشانی سے انکی فطری سنجیدگی اور شرافت کا پتہ چلتا تھا۔

کنول ابتک بیہوش تھی۔ شیام نرائن کی گھنٹہ بھر کی کوششوں کے بعد کنول نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ لیکن اس کی وحشت کی وہی حالت رہی۔ بارہا اس کو یہ خیال آیا کہ اس نے ایک پریشان خواب دیکھا ہے۔ لیکن واقعات کو دیکھکر وہ پھر مایوس ہو جاتی۔ اس کے جذبات میں سخت تلاطم تھا۔ راج کشور کا اس کو اتنے دنوں مغالطہ میں رکھنا ایسا امر تھا کہ اُس کی غیور طبیعت اس کو برداشت ہی نہ کر سکتی تھی۔ رہ رہکر وہ غصہ اور رنج سے کانپ اُٹھتی۔ اسی اُدھیڑ بن میں اُس پر پھر ایک ہیجانی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

شیام نرائن نے کہا مرض سخت ہے۔ اور شدید گرمی کی وجہ سے کلکتہ میں رہکر علاج مناسب نہ ہوگا۔ چنانچہ دو روز کے بعد جب کنول کی حالت کچھ سنبھلی تو یہ رائے قرار پائی کہ کچھ دنوں کے لئے سب لوگ نینی تال چلے جائیں۔ راج کشور کا خیال کنول کو بار بار ستا رہا تھا۔ اس خیال سے کہ راج کشور نے اس کی امیدوں کو اسطرح برباد کیا وہ غصہ اور انتقام کی آگ سے بھڑکنے لگتی۔ برج نرائن کو بھی ہیڈ مسٹرس کی زبانی یہ واقعہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ راج کشور نے ان کا حال کیوں اُن سے اتنے دنوں پوشیدہ رکھا۔ شیام نرائن کی ہمدردی۔ ان کی دلکش جوانی اور قابلیت نے بہت جلد کنول کی آنکھوں میں اسکو ایک امتیازی حیثیت دیدی۔ کنول کی بیمار لیکن فاتحانہ آنکھوں سے متاثر نہ ہونا کیا معنی۔ چنانچہ برج نرائن بابو کے اصرار سے وہ بھی نینی تال چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔

---

راج کشور نے معلوم نہیں کسطرح ایک ہفتہ بکسر میں گذارا۔ خدا خدا کر کے کلکتہ واپس آیا۔ اور اس خوف کیساتھ

جو ضمیر کی ملامت کی وجہ سے آدمی میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ ڈرتا ڈرتا۔ برج نرائن کے یہاں پہنچا۔ لیکن مکان کو مقفل پا کے اُس کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ سو سو وسوسے دل میں آئے اور گذر گئے۔ پڑوس میں برج نرائن بابو کے ایک ملاقاتی رہتے تھے۔ راج کشور انکے پاس انتہائی سراسیمگی کی حالت میں پہنچا۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک نوجوان ڈاکٹر صاحب کا علاج شروع ہوا تھا۔ ان کی رائے سے وہ لوگ نینی تال گئے۔ ڈاکٹر صاحب بھی ان کے ساتھ گئے۔

عشق است وہزار بدگمانی۔ نوجوان ڈاکٹر کا علاج شروع ہوتے ہی نینی تال جانا اور پھر ان کا بھی ساتھ جانا۔ راج کشور کو سینکڑوں وسوسے ہوئے پوچھا آپ ان ڈاکٹر صاحب کو جانتے ہیں؟ کیسے آدمی ہیں۔ شادی شدہ ہیں یا نہیں۔

"جی ہاں میں ڈاکٹر شیام نرائن صاحب کو ایک زمانہ سے جانتا ہوں۔ انھوں نے ڈاکٹری کلکتہ ہی سے پاس کی ہے بنارس میں پریکٹس کرتے ہیں۔ عمر قریب چھبیس سال کی ہوگی۔ ان کی شادی کے متعلق بہت سی روایتیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے وہ ازدواجی زندگی کے قائل ہی نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنی مرضی سے ایک غریب لڑکی سے شادی کی تھی۔ مگر شادی کے بعد ہی لڑکی کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد وہ شادی کے نام سے گھبراتے ہیں"

ان جوابات سے راج کشور کی خاطر خواہ تشفی نہیں ہوئی پریشان واپس گھر آیا۔ ملازم نے کہا برج نرائن بابو کا ملازم روز آتا تھا۔ آخری روز یہ خط دے گیا ہے۔ اور کہا کہ اس کو صرف راج کشور بابو ہی کو دینا۔ راج کشور نے خط اسطرح لیا کہ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ چہرہ پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ دل بلیوں اُچھل رہا تھا۔ لفافہ پر کنول کی نازک انگلیوں سے لکھا تھا۔ بابو راج کشور۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ کانپتے ہوئے اُس نے لفافہ کھولا۔ لکھا تھا۔

ڈیر راج کشور بابو تسلیم

اپنی پرانی ہیڈ مسٹرس سے، کچھ دلچسپ اور عجیب باتیں معلوم ہوئیں۔ اسکی کیا شکایت کہ آپ نے نہیں معلوم کن ارادوں سے میرے سچے جذبات کو آلۂ تفریح بنانا پسند کیا۔ ہاں اسکی شکایت ضرور ہے کہ آپ ایسے وقت ہم لوگوں سے یکایک علیحدہ ہوگئے۔ جب پتا جی کو میری بیماری کی وجہ سے آپ کی سخت ضرورت تھی۔ ہم لوگ تبدیل آب وہوا اور علاج کی غرض سے نینی تال جا رہے ہیں۔ اگر میں سخت جان زندہ رہی تو دو ماہ کے بعد واپسی ہوگی۔ اسوقت امید ہے کہ نیاز حاصل ہو۔

آپ کی مخلص

کنول

خط کو پڑھ کر جو کیفیت راج کشور کی ہوئی وہ قابل عبرت تھی۔ اس کو محسوس ہونے لگا کہ کسم کے دل دکھانے کا بدلا اس کو ملنا شروع ہو گیا ہے۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا، جیسے کسی بہت پیاسے آدمی کے منھ تک پانی لاکر علیحدہ کرلیا جائے اور وہ پیاس کی تکلیف سے لوٹنے لگے۔ راج کشور کو اپنے آپ سے نفرت معلوم ہونے لگی۔ دُنیا اس کے لئے تاریک ہوگئی اور اُس کو ایک ایک لمحہ کتنا دشوار ہوگیا۔ دنیا کی تمام نظر فریبیاں اسے بے معنی نظر آنے لگیں، اور وہ ایک نیم غشی کی حالت

میں پلنگ پر پڑ گیا۔

---

کسوم بکبر میں زندگی سے بیزار ایک جانکاہ استقلال کے ساتھ زندگی کی گھڑیاں کاٹ رہی تھی۔ نول کشور کی بی بی نے اس کے دل لبھانے کی بہت کوششیں کیں۔ لیکن ان کو کیا معلوم تھا کہ اس کا کلیجہ اندر ہی اندر پھنکا جا رہا ہے۔ کسوم دن بھر اکیلے کمرہ میں پڑی رہتی۔ اصرار کرنے سے دو چار نوالے کھا لیتی۔ وہ دن بدن زرد ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے گلاب سے رخسار زعفرانی ہو گئے تھے۔ آنکھیں ہر وقت ڈبڈبائی رہتیں۔ رات بھر اس کو نیند نہ آتی۔ اکثر پلنگ سے اٹھ کر وہ گھنٹوں ٹہلا کرتی۔ اور جب ضبط نہ ہو سکتا تو رو پڑتی۔ اسکو اپنا کوئی ہمدرد دنیا بھر میں نہ نظر آتا تھا۔ اکثر تاروں بھری راتوں میں آسمان کی طرف دیکھ کر کہتی: "اے پرماتما کیا میں یوں ہی ہمیشہ کے کڑھنے کیلئے پیدا کی گئی ہوں۔ جب سے دنیا میں آئی۔ مصیبت جھیلا کی۔ ان کا ساتھ ہوا۔ چار دن چین سے گزرے۔ خیال ہوا اب دن بھلے آئے ہیں۔ لیکن وہ تو میں پیدا کی گئی ہوں مصیبت جھیلنے کے لئے۔ پھر جب حالت یہی ہے۔ تو آخر مجھے موت کیوں نہیں آتی۔ ہزاروں شخص جو جینے کے آرزومند ہیں۔ جنکی ذات سے سینکڑوں امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔ وہ تو اس آسانی سے موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن میری دن رات کی یہ دعا کیوں قبول نہیں ہوتی۔ میں دنیا کے لئے ایک بار ہوں فضول۔ میری موت پر کوئی رونے پیٹنے والا نہیں۔ میری ذات سے کسی کو ذرہ بھر کا فائدہ نہیں۔ پھر آخر میرے زندہ رکھنے میں قدرت کو کیا دلچسپی ہے۔ قدرت کو بھی میری کلفتوں میں مزہ آتا ہے۔ کیا اس سفاک کھیل کے لئے ایک میری ہی نامراد جان تھی۔ پرماتما کسی طرح اس جانکنی سے نجات دے۔ آنکھوں کا پانی خشک ہو گیا۔ لیکن تو نے کبھی میری آہوں کی شنوائی نہ کی۔ میری تلخ کامیاں آزمائش کی حد سے کب کی گزر چکی ہیں مجھے اس بے رحم دنیا سے رہائی عطا کر۔"

ایک روز شام کے وقت وہ حسب معمول اداس بیٹھی تھی کہ دیوار کی درز میں ایک کاغذ لپٹا ہوا ملا۔ یہ وہی خط تھا جو راج کشور نے کسوم کو دینے کے لئے لکھا تھا اور پھر کچھ سوچ کر ڈال دیا تھا۔ کسوم نے جب اسے کھولا تو سخت تعجب ہوا کہ خط اسی کے نام کا ہے اور تحریر ہے راج کشور کی۔ پڑھنا شروع کیا اور پڑھتے پڑھتے اس طرح اڑ اٹھی جیسے جلتا ہوا لوہا کسی کے بدن میں چھوا دیا جائے اور وہ تڑپ اٹھے۔ خط پڑھکر کچھ دیر کے لئے تو وہ دیوانی سی ہو گئی۔ کبھی روتی کبھی ہنستی کبھی اٹھکر بھاگتی۔ خیر سے اسوقت کوئی اس کے پاس نہ تھا۔ خط کو پھر پڑھا۔ ایک ایک جملہ اسکے دل پر زہر کے بجھے ہوئے نشتر چبھو رہا تھا۔ اس کو اپنی ذات سے شرم آنے لگی۔ رہ رہ کر اسکے کلیجہ میں ایک ٹیس اٹھتی اور وہ تلملا اٹھتی۔ آخر کار اپنی بے کسی اور مجبوری پر منھ ڈھانپ کر رونے لگی۔ معلوم نہیں کبتک وہ اپنی تیرہ بختی پر آنسو بہاتی اگر ملازمہ اس کا کھانا رکھنے نہ آتی۔ کسوم نے گھبرا کر آنسو پونچھے۔ اور اخفائے راز کے لئے کسی طرح کچھ نوالے حلق سے نیچے اتارے۔ اسے یہ خوف تھا کہ اگر کھانا نہ کھائے گی تو نول کشور کی بی بی آکر اصرار کریگی۔ اور ممکن ہے ان کے سامنے وہ ضبط نہ کر سکے۔ ماما کے برتن لیجانے کے بعد وہ کچھ دیر تک غور کرتی رہی

اور پھر آہستہ آہستہ یوں بولی کہ "پرماتما میں اگر اب بھی زندہ رہوں تو بے حیائی اور ہٹ دھرمی ہے۔ اب تک میں اپنے کو صرف بدقسمت ہی سمجھتی تھی۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ میں ناپاک بھی ہوں۔ میری بے شرم اور بدنصیب ذات سے دنیا جتنی جلد خالی ہو اچھا ہے۔" اتنے میں گھڑیال نے بارہ بجائے۔ وہ گھبرا کر اٹھی۔ اور اسطرح جیسے سب کچھ پہلے سے سوچ چکی تھی۔ کاغذ کے دو ٹکڑوں پر چند سطریں لکھیں اور دبے پاؤں جاکر اسکو نول کشور صاحب کی بی بی کے سرہانے رکھ آئی۔ اس کے بعد اُس نے ایک حسرت بھری نگاہ چاروں طرف ڈالی اور ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر چپکے سے دروازہ کھولا۔ اور بغیر کسی ارادہ کے ایک طرف چلدی۔ کسوم کے طرزِ عمل میں بجائے جھینپ یا کلفت کے اب سکون اور استقلال کے آثار تھے۔ وہ کوئی مستقل ارادہ کر چکی تھی۔ جس کے اثر سے وہ اب ان عارضی تکالیف سے بے خبر ہو چلی تھی۔ اسے دور سے ریل کا رنگین سگنل نظر آیا۔ اور وہ رات کے سناٹے میں اس عمیق قرمزی رنگ کو دیر تک دیکھتی رہی۔ وہ ایک طرف بے اختیار بڑھی۔ وہاں پہونچ کر معلوم نہیں اس کے دل میں کیا خیال آیا کہ اسٹیشن کی طرف بڑھی۔ پلیٹ فارم پر کچھ آدمی گاڑی کے انتظار میں اونگھ رہے تھے۔ وہ ایک کنارے بیٹھ کر اپنے تاریک ماحول پر غور کرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں گاڑی سنسناتی ہوئی چلی آئی۔ مسافر چڑھنے اُترنے لگے کسوم بھی ایک غیر ارادی طور سے اُٹھی اور ایک خالی ڈبہ میں بیٹھ گئی۔ سیٹی ہوئی اور گاڑی اکبر اسٹیشن سے آہستہ آہستہ چلدی۔ چاندنی رات تھی۔ چھٹکے ہوئے تارے جھلملا جھلملا کر ایک مبہم اشارے سے کسوم کو اپنی طرف بلا رہے تھے۔ رات کی فطری تاریکی میں بھی ہمدردی اور آشنائی کی جھلک نظر آرہی تھی۔ کسوم کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کے اور قدرت کے درمیان کے تمام حجابات ایکبارگی اُٹھ گئے ہیں۔ اور اس نہ طے ہونیوالی راہ کی منزلیں اُس نے سر کرلی ہیں۔ اور رفتہ رفتہ اُسکو یہ معلوم ہونے لگا کہ اسکی روح اس وقت کے مناظرِ قدرت میں تحلیل ہوتی جارہی ہے۔ اور وہ خود اوپر سے تاروں کے ساتھ دنیا والوں پر ایک حقارت کی نگاہ ڈال رہی ہے۔ تخیلات کی اس مسرور کن جولانگاہ میں وہ معلوم نہیں کبتک محو رہتی۔ کہ گاڑی مغل سرائے اسٹیشن پر رُکی۔ اور قلیوں نے پکارنا شروع کیا۔ کاشی کے جانے والے۔ کاشی کے جانیوالے۔ یہاں اتر پڑیں۔ کاشی کے متبرک نام پر کسوم چونک پڑی۔ اسے خیال ہوا کہ زندگی کا آخری دور ختم کرنیکے لئے کاشی گھاٹ سے بہتر کون مقام ہوسکتا ہے۔ اس خیال سے وہ گاڑی سے اُتری اور ایک قلی سے کاشی جانیوالی گاڑی کو پوچھکر اسمیں جا بیٹھی۔ اس کے ہر انداز میں ایک اطمینان اور استغنا تھا۔ شاید وہ ایک تہورانہ جذبہ میں رنج و غم کے حدود سے گزر چکی تھی۔

کاشی پہونچکر کسوم سیدھے اس متبرک دریا کے کنارے پہنچی جس نے بنارس کو ہندوستان کے شہروں میں ایک امتیازی حیثیت دیدی ہے۔

(باقی)

عبد السلام فاروقی۔ بی۔ اے

# خواجہ آتش کے متعلق کچھ جدید تحقیق و تفتیش

یادش بخیر، خواجہ آتش کی عظمت میرے دل میں ایک عرصہ سے ہے اور ساتھ ہی اسکی خواہش بھی کہ اگر علاوہ ان متداول تذکروں کے کہیں سے انکے صحیح و مفصل حالات مل سکیں تو ان کو ترتیب دیکر پیش کروں۔ کیونکہ ایک تو آتش اور ناسخ کے زمانہ کے حالات زیادہ تر پردۂ خفا میں ہیں۔ چنانچہ ناسخ کے والد اور خاندان کا حال، ناسخ اور آتش کی پیدائش کا زمانہ، یہ اور ایسی ہی اکثر باتیں آج تک صحیح صحیح لوگوں کو نہ معلوم ہو سکیں۔ دوسرے عام تذکروں میں جو حالات خواجہ صاحب کے ملتے ہیں چونکہ ان کا ماخذ بیشتر بلکہ تمامتر۔ محمد حسین آزاد کا تذکرہ "آب حیات" ہے، اس لئے بجائے تسکین بخشنے کے اور زیادہ بے اطمینانی دل میں پیدا کر دیتے ہیں۔ اور خواجہ موصوف کے حالات کا ایک ایسا متضاد مجموعہ سامنے آتا ہے جس پر کسی طرح یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ گل رعنا اور آب بقا ضرور ظلماتِ ادبیات میں خضرِ راہ بنتے ہیں مگر پھر افسوس ہے کہ اُن کے مصنفوں کو ذرا پہلے کا زمانہ نہیں مل سکا اور مؤخر الذکر مبسوط نہیں!

میں نے اس تلاش میں مختلف تذکرے[1] پڑھے بہت سی کتابیں دیکھیں اور بہت کچھ سرگردانی کے بعد ایک گونہ تسلی حاصل کر چکا تھا کہ مرزا جعفر علی خاں اثر کا مضمون بعنوان "خواجہ آتش" رسالہ زمانہ کی اکتوبر اور نومبر ۲۹ء کی اشاعتوں میں نکلا۔ مجھے مسرت ہوئی کہ چلو مجھ سے زیادہ اہل شخص نے جو روشن خیال۔ سخن سنج اور تنقید کا علمبردار بھی ہے۔ جب اس مبحث پر قلم اُٹھایا ہے تو یقیناً تنگ نظری، جنبہ داری، تعارضِ حالات اور نادرستی روایات کو دور کر کے ایک عمدہ اور قابل ایراد و اضافہ چیز منظرِ عام پر لائے گا۔ میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔ میں نے نہایت پُرشوق ہاتھوں سے اُسے لیا اور بیتاب نگاہوں سے پڑھا۔ لیکن پڑھنے کے بعد توقعات غلط ثابت ہوئے اور معلوم ہوا کہ اُن کی حیثیت صرف ایک جامعِ ناقل کی ہے۔ ناقد بلند

---

[1] جن میں ایک تذکرہ "خازن الشعرا" قلمی قابلِ ذکر ہے۔ یہ کتاب تقریباً ۱۲۵۰ھ کی تصنیف ہے اور زبان فارسی میں اجلی خاندان کے اُردو اور فارسی شعرا کا تذکرہ ہے اسکے مصنف مولانا شاہ سید علی کبیر عرف میر جان تھے۔ میں نے اسکا اصل نسخہ بخط مصنف، حکیم سید شاہ نذیر احمد صاحب کے پاس دیکھا ہے۔ یہ ایک فاضل شخص ہیں۔ جو مصنف تذکرہ کے نواسے ہیں۔ اور موجودہ سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل الہ آباد کے ولی عہد ہیں۔ اگرچہ اس کتاب سے مجھے اس سے زیادہ مدد نہ ملسکی کہ مصنف تذکرہ کے چھوٹے بھائی سید محمد کبیر صاحب رضا اجلی قدسی تخلص بھی خواجہ آتش کے شاگرد تھے لیکن اسکی زیارت بھی جانا نہ ہونا اتفاق و حسن اتفاق سے کم نہیں افسوس ہے اوراق منتشر ہیں ورنہ شاہ صاحب اسکی نشر و اشاعت کی طرف سے بے نیاز۔ اسکا ذکر صاحب گل رعنا نے بھی ایک جگہ کیا ہے

اور صاحبِ بصیرت مورخ کی حیثیت وہ نہیں رکھتے۔ وہ آزاد کی ذہنیت اور مشن کی تائید اور تقلید تو کر سکتے ہیں، مگر اس کی تنقید کا حوصلہ اور تردید کی ہمت نہیں کر سکتے۔

نادرستیٔ بیانِ صاحبِ آبِ حیات "یا نمی دانست یا دانستہ اخفا کردہ است"

چونکہ میرے نتیجۂ تلاش و تحقیق سے مرزا صاحب کا مضمون یا نظریہ جداگانہ ہی نہیں بلکہ مخالف تھا۔ اس لئے اس مضمون میں کہیں کہیں اسکا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ عنوان کا مطالبہ تو یہ تھا کہ میں بھی ان کی سوانح عمری لکھ دیتا۔ لیکن یہ تطویلِ محض ہو گی۔ اور اسلئے تحصیلِ حاصل۔ قدرِ مشترک اور عام مسلّم حالات کو چھوڑ کر کہ وہ آبحیات۔ گلِ رعنا۔ آبِ بقا میں درج ہیں۔ چند نئے حالات و نتائج جو میری تلاش و تحقیق میں آئے اُن کے حوالہ قلم کرتا ہوں

## سنہ ولادت

گلشنِ بیخار۔ گلِ رعنا۔ آبحیات۔ خمخانہ جاوید اور سخن شعرا اس باب میں ساکت ہیں۔ آبِ بقا (مصنفہ خواجہ عشرت لکھنوی) میں صفحہ (۹) پر درج ہے "اسی اثنا میں نواب شجاع الدولہ بہادر نے اپنے فرزند آصف الدولہ کی شادی کی۔ ...... یہ واقعہ سنہ ۱۷۶۹ء کا ہے۔ یہ چہل پہل ہو رہی تھی کہ خواجہ علی بخش[۱] کے گھر میں خواجہ حیدر علی آتش پیدا ہوئے۔

اگرچہ اثر صاحب نے خواجہ صاحب کے حالات میں اور خصوصاً زمانۂ ولادتِ خواجہ کا تعین و اندازہ کرنے میں "آبِ بقا" ہی سے استفادہ کیا ہے مگر خدا جانے کیسے بلا دلیل سنہ ولادت "تقریباً سنہ ۱۷۶۴ء" لکھا ہے۔ لیکن آبِ بقا کی روایت، بعض حالات کے ملانے سے صحیح نہیں معلوم ہوتی۔

(۱) آبِ بقا میں صفحہ ۱۳ پر ہے:۔ "جب میر تقی میر کا انتقال ہوا (سنہ ۱۲۲۵ھ میں) تو آتش اکتالیس برس کے تھے"۔ گویا سنہ ولادت سنہ ۱۱۸۴ھ ہے۔

(۲) آبِ بقا صفحہ (۹) پر ہے:۔ "آتش اچھی طرح جوان نہیں ہونے پائے تھے اور تعلیم بھی نامکمل تھی کہ باپ نے انتقال کیا۔ مزاج میں آوارہ گردی تھی اور سر پر کوئی مربی موجود نہ تھا۔ فوج کے لڑکوں کی صحبت میں آتش بانکے اور شوردشت ہو گئے۔ ...... اس جوہر کے قدردان، فیض آباد میں نواب میر محمد تقی ترقی تھے۔ جو آتش کو نوکر رکھ کر اپنے ساتھ لکھنؤ میں لے آئے۔ انھیں کے ساتھ ناسخ بھی فیض آباد سے لکھنؤ آئے"۔ (صفحہ ۲۵۹ پر گلِ رعنا میں بھی تقریباً یہی ہے سوا ناسخ کی ہمراہی کے)

(۳) آبِ بقا صفحہ ۱۴ پر ہے:۔ "آتش نے ناسخ کے مرنے کی خبر سنی تو چیخ مار کر رونے لگے"۔ ... کہنے لگے:۔ "میاں ...... ہم اور وہ فیض آباد میں مدتوں ایک رئیس کے نوکر رہے۔ مدت تک ہم نوالہ ہم پیالہ رہے"۔

(۴) ناسخ کا لکھنؤ آنا سنہ ۱۱۹۱ھ میں ثابت ہوتا ہے نواب میر محمد تقی ترقی کے ہمراہ۔ اور قیاس چاہتا ہے کہ یہ پہلے پہل کا آنا تھا، کیونکہ لکھنؤ سے ناسخ کا واپس فیض آباد جانا اور دوبارہ لکھنؤ آنا کہیں سے معلوم نہیں ہوتا۔ اچھا اور ناسخ لکھنؤ آئے اُسوقت جب بقول آزاد "لکھنؤ دار الخلافہ" ہوا یا بقول خواجہ عشرت، جب آصف الدولہ نے سنہ ۱۱۸۸ھ لکھنؤ کو بیت السلطنت بنایا

---

[۱] قاموس المشاہیر میں خواجہ آتش کے والد کا نام خواجہ علی محسن چھپا ہے۔ سراج

اس کے دو چار سال کے بعد، (آب بقا صفحہ ۱۲)

ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ آتش بھی ناسخ کے ساتھ پہلے فیض آباد میں مدتوں ایک نواب کے نوکر رہے پھر سنہ ۱۱۹۱ھ میں لکھنؤ آئے۔ اب یہ ہرگز قرین قیاس نہیں کہ آتش سنہ ۱۱۸۴ھ میں پیدا ہوئے ہوں اور سنہ ۱۱۹۱ھ میں سات ہی برس کے سن میں بانکوں میں نوکر بھی ہو گئے ہوں اور لکھنؤ آئے ہوں۔ حالانکہ آتش کے حالات میں تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ "باپ کے مرنے کے وقت اچھی طرح جوان نہیں ہونے پائے تھے اور تعلیم نامکمل تھی"۔ ابھی اچھی طرح جوان نہ ہونے کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ کی موت کے وقت انکی عمر (کم سے کم) گیارہ بارہ برس کی رہی ہوگی اور میر تقی کی نوکری اور لکھنؤ آنیکے وقت انکی عمر (کم سے کم) پندرہ سولہ برس کی ہوگی۔ پھر اگر سنہ ۱۱۹۱ھ اُن کا آنا ناسخ کے ہمراہ صحیح مانا جائے تو سوا اسکے چارہ ہی کیا ہے کہ ان کی عمر کو "اسی بیاسی" برس سے (جیسا آب بقا میں ہے) کچھ زیادہ مانا جائے اور سنہ ولادت کو سنہ ۱۱۸۴ھ سے کچھ پہلے کیونکہ غالباً سنہ وفات متفق علیہ ہے یعنی ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ع۔

یہیں ایک سوال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب آتش کی عمر، میر تقی میر کی وفات کے وقت اکتالیس برس کی (یا کچھ زیادہ) تھی تو میر صاحب نے اپنے نکات الشعرا میں ان کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میر صاحب نے یہ کتاب اپنے شباب کے زمانہ میں دلی میں لکھی تھی اور خواجہ صاحب کی شہرت بعد میں ہوئی۔

## آتش اور دلی

آزاد نے خواجہ کے نام کے ساتھ فیض آباد تک کا نام تو لکھا نہیں، دلی تو پھر بھی دُور تھی۔ لکھتے ہیں:- "باپ دلی کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ میں جاکر سکونت اختیار کی"۔ اب اس مجمل جملہ سے خواہ یہ سمجھ لیجئے کہ باپ ہی نے دلی چھوڑ کر لکھنؤ میں سکونت اختیار کی (اور یہ صریحاً غلط ہے) خواہ یہ نتیجہ نکال لیجئے کہ خواجہ آتش لکھنؤ میں جاکر رہ پڑے (فیض آباد کا ذکر ندارد) آب بقا اور گل رعنا میں ہے کہ فیض آباد میں پیدا ہوئے اور مرزا تقی کے ساتھ لکھنؤ گئے"۔ لیکن کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آتش بھی کبھی دلی گئے تھے یا نہیں۔

ہمکو کلیات آتش ۔ ردیف نون میں ایک غزل ملتی ہے۔ "اُلجھا ہے دل بتوں کے گیسوئے پُر شکن میں" الخ ان اشعار کو پڑھیئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ بچپن کی مشق اور ابتدائی کلام ہے۔ ذیل کے اشعار کسی کہنہ مشق اور ذی رتبہ شاعر کے منھ پہ نہیں کھلتے۔

سنبل سے بال اُس نے جس وقت سے منڈائے ۔۔۔ کنگھی وواکی خاطر ملنے لگی چمن میں

عطر گلاب مل کر حلقہ میں یار بیٹھا ۔۔۔ بلبل پکڑنے آیا صیاد انجمن میں

تُرک فلک ہی سپاہی۔ ظاہر ہے تُرک اپنا ۔۔۔ عاقل جو ہو وہ کرلے تمیز مرد و زن میں

اُسکو دکھا کے تونے اُس پہ جو تیر جوڑا ۔۔۔ پھر وں رہی لڑائی شیر اور گرگدن میں۔ وغیرہ

اسی غزل میں ایک شعر ہے:-

اک تختہ ہفت کشور دہلی کا ہی ہمارے ۔۔۔ نو آسماں ہیں اپنے اکبر کے نورتن میں

غور کیجئے دہلی کی تخصیص "ہمارے" کے لفظ کے ساتھ کیا بتاتی ہے اور "اپنے اکبر" کا لہجہ کس امر پر روشنی ڈالتا ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ آتش اکبر شاہ[51] ثانی بادشاہ دہلی اور خود شہر دہلی کی تعریف میں کہتا ہے کہ ہمارے شہر دہلی کے مقابلہ میں ہفت اقلیم ہیچ ہے۔ اور ہمارے بادشاہ اکبر ثانی کے دربار میں نو آسمان مصاحب ہیں جو "نورتن اکبری" کا جواب ہیں۔ صاف طور پر یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ آتش دلی میں پیدا ہوئے اور وہاں کچھ مدت تک رہے۔ کیونکہ میں اوپر لکھ آیا ہوں کہ اُن کے حالات کچھ صاف صاف نہیں ملتے۔ لیکن اتنا تو اس شعر سے ضرور معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ آتش چاہے فیض آباد میں پیدا ہوئے ہوں مگر وہ دلی بھی گئے اور رہے ہیں۔ اور آبائی وطن کو خود بھی دیکھ کر یہ غزل وہاں کہی ہے اور گو وہ لکھنؤ آ کر مصحفی کے شاگرد ہوئے مگر ایک شاعر تلمذ سے قبل بھی کچھ کہہ لیتا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آتش نے فیض آباد یا لکھنؤ میں بیٹھ کر یہ غزل کہی ہو۔ لیکن میرے خیال میں اگر آتش دلی نہ گئے ہوتے تو "اپنے اکبر" اور "ہماری دلی" جیسے جچی لہجہ میں تعریف نہ کرتے۔ آخر میں اتنا اور عرض کردوں کہ مجھے اعتراف ہے کہ یہ میرا ایک احتمال و قیاس ہے۔ جسکی تائید شاید آئندہ کسی انکشاف و تحقیق میں ہو سکے۔ اسوقت اپنی تائید میں دو باتیں کہہ سکتا ہوں:۔

(۱) گل رعنا صفحہ ۲۶۳ و ۲۶۴ پر ہے: "آتش کی غزلوں میں دلی کے ٹھیٹ الفاظ مثلاً اکھڑیاں۔ زور۔ بل بے۔ میرے شامل۔ بھاریاں وغیرہ زیادہ ملتے ہیں۔ عجب نہیں یہ اُن کا ابتدائی کلام ہو۔"

(۲) آزاد نے لکھا ہے کہ اُن کے اکثر اشعار ضائع ہو گئے۔ ممکن ہے ضائع شدہ غزلوں میں اور باتیں بھی دلی کی بابت رہی ہوں۔

## اُستادی نزاع

آزاد نے اس بحث کو بہت آب و رنگ دیکر لکھا ہے۔ اس سے بظاہر اُسکی دو غرضیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) آتش کو چونکہ آزاد شیعہ ظاہر کرتے ہیں۔ اُسلئے اُسے ایک سُنّی اُستاد مصحفی سے لڑا دینا چاہا اور باور کیجئے کہ اگر ان کو اس قسم کی کوئی اور بات بھی ملجاتی تو وہ انشا اور مصحفی کا سا معرکہ آتش و مصحفی کے درمیان پیدا کر دیتے۔

(۲) آزاد، جو وطناً دہلوی اور مذہباً لکھنوی تھے۔ جہاں لکھنؤ پرستی میں لکھنؤ کو "دار الخلافہ" جیسے لقب سے ملقب کرتے ہیں۔ وہ اس فکر میں بھی ہیں کہ لکھنؤ کی زبان کو دلی کی زبان کی تقلید سے آزاد کر دکھائیں۔ اور اس خیال میں جان اُسوقت تک نہیں پڑ سکتی تھی۔ جبتک آتش و ناسخ کو (جن سے لکھنوی زبان کی عمارت قائم سمجھی جاتی ہے) کس طرح مصحفی سے الگ نہ کر لیا جائے۔ ناسخ کو تو اُس نے صاف الگ کر دکھایا۔ بچے آتش تو اُن کے لئے اُس نے ذیل کا قصہ تصنیف کیا۔

آزاد کے الفاظ یہ ہیں:۔ (آبحیات تذکرہ آتش صفحہ ۳۸۰)

"کتب تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ شعرا جو شاگردان الٰہی ہیں۔ مجازی اُستادوں کے ساتھ اُنکی بگڑتی ہی چلی آئی۔

[51] ابو النصر معین الدین اکبر شاہ ثانی شعاع تخلص ابن شاہ عالم ۱۷۶۰ء میں پیدا ہوئے ۱۸۰۶ء میں بادشاہ بنے اور ۳۱ سال سلطنت کر کے ۱۸۳۷ء میں انتقال کر گئے (قاموس المشاہیر)

چنانچہ اُن کا بھی اُستاد سے بگاڑ ہوا۔ خدا جانے بنیاد کن کن جزئیات پر قائم ہوئی ہوگی۔ اور اُن میں حق کس کیطرف تھا۔ آج اصل حقیقت دُور کے بیٹھنے والوں پر کھلنی مشکل ہے۔ مگر جہاں سے کھُلم کھلا بگڑی اُسکی حکایت یہ سُنی گئی کہ......"

اس کے بعد وہ بگڑا، کفن بگڑا کے مشاعرہ کا قصہ لکھا ہے کہ آتش نے اپنے اشعار اُستادوں کو سُنا کر کچھ تعلّی کی مصحفی نے انکے شعروں کے جواب میں وہ شعر کہہ کر ایک لڑکے سے پڑھوا دئے۔ جب مشاعرہ میں ان اشعار کی واہ ہوئی تو آتش کو شبہ ہوا اور اُستاد سے بگڑ کر کہا کہ "یہ آپ ہمارے کلیجے میں چھُریاں مارتے ہیں۔ نہیں تو اس لونڈے کا کیا منھ تھا جو ان قافیوں میں شعر نکالتا۔ مگر مصحفی کے یہ اشعار آتش کے اشعار سے کمزور تھے (ہمنے آزاد کے الفاظ نقل نہیں کئے کہ طول ہوجاتا اسکا خلاصہ لکھدیا)

خواجہ آتش کی سپاہیانہ وضع اور اُس پر آزاد کی رنگین اور فریب کار تحریر۔ نتیجہ جو کچھ ہوا وہ ہرگز قابل حیرت نہیں کہ یہ روایت شہرت پاگئی اور بعد میں مقلدین تذکرہ نویسوں نے (الا ماشاءاللہ) اسکو اپنے یہاں نقل و درج بھی کردیا۔ لیکن عقل دُور رس اس پر حسب ذیل تنقیحیں قائم کرتی ہے:۔

(۱) ہمارے سامنے گل رعنا موجود ہے وہ اس خصوص میں ساکت ہے۔ اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو صاحب گلِ رعنا جنھوں نے آتش کی موت کا حال بالکل آزاد ہی کے الفاظ میں لکھدیا ہے۔ ضرور اسکو اپنی کتاب میں لکھتے۔

(۲) شعر الہند میں بھی یہ روایت نہیں ہے۔

(۳) تذکرۂ آبِ بقا میں آتش کے حالات، آبِ حیات سے بہت زائد لکھے ہیں۔ وہ اس مشاعرہ کا ذکر بایں الفاظ کرتے ہیں (صفحہ ۱۶) "تحسین گنج میں میاں تحسین علی خاں ......................

خواجہ سرا کے ہاں مشاعرہ ہوا، چلن بگڑا، کفن بگڑا، اس میں بھی پالا آتش کے ہاتھ رہا اور ناسخ کی غزل کمزور رہی۔"

خواجہ عشرت، لکھنوی ہیں اور شاد پیر و میر کے شاگرد۔ اُردو زبان کی خدمت، تاریخ نویسی، لغت نویسی، قواعد نویسی سے ایک مدت سے کرتے چلے آتے ہیں۔ اور اگرچہ اُنھوں نے ناسخ و آتش کا زمانہ نہیں پایا مگر پرانوں کی آنکھیں دیکھیں اور قصّے سُنے ہیں ـــ خود تلاش و تحقیق اور تفتیش و جستجو کا مادّہ رکھتے ہیں۔ ان حالات میں ان کو لکھنؤ کے حالات کا (گو وہ ماضی ہی کیوں نہ ہوں) بمقابلہ آزاد کے (جو غالباً لاہور میں آبِ حیات لکھنے بیٹھے تھے۔) زیادہ اور صحیح تر معلوم ہونیکے موقعے حاصل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کیا بہ لحاظ مقدار و مواد اور کیا بلحاظ اعتبار و استناد اُنکے ہاں خواجہ آتش کے زیادہ حالات ہیں۔ وہ اس خاص مشاعرہ کا موقعہ اور محل تک بتا رہے ہیں۔ مگر اس واقعہ کا ذکر تک نہیں کرتے۔ اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو لکھنؤ جیسے مقام پر خواجہ عشرت جیسے جوئندہ کو اس روایت کا ملنا ناممکن نہ ہونا چاہئیے۔ اچھا روایت نہ ملنے کو بھی جانے دیجئے۔ خواجہ عشرت نے آبحیات کے بعد اپنا تذکرہ لکھا ہے۔ وہ بھی مثل دیگر تذکرہ نویسوں کے اس کو اپنے یہاں نقل کرسکتے تھے مگر نہیں نقل کرتے۔ آخر کیوں؟ میرا خیال ہے کہ اُنھوں نے اس روایت میں اصلیت کا شائبہ نہیں پایا، اس لئے اسے اعتبار و استناد کے پایہ سے ساقط سمجھا۔ پھر ذرا غور تو کیجئے (نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا) بھری محفل مشاعرہ میں

جب یہ گفتگو پیش آئی تھی تو نا ممکن ہے کہ لوگوں میں مشہور نہ ہوتی اور خواجہ عشرت کو یہ روایت کسی طریق سے نہ پہونچ سکتی اور آزاد کو لاہور میں پہونچ جاتی!

(۳) آتش ایک صلح کل اور بقول آزاد "سیدھے سادے بھولے بھالے آدمی تھے، ان اوصاف کے آدمی پر تو یہ بات کچھ کھلتی نہیں کہ ذرا سی بات پر استاد سے سر مجلس بگڑ بیٹھے۔ شاگرد کی تعلیوں پر استادوں نے اکثر اسطرح کی در پردہ تنبیہیں کی ہیں۔ اور سعادتمند شاگرد ہمیشہ اس سے متنبہ اور شرمندہ ہوتا ہے۔ لیکن آزاد نے جو رویہ آتش کا پیش کیا ہے۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آتش کو سعادت مندی چھو نہیں گئی تھی اور نیک نفسی اور حیا کا اس میں نام و نشان نہ تھا۔ وہ اس استاد کی مطلق قدر نہ کر سکا۔ جو میر تقی کے پہلو بہ پہلو نظر آتا ہے۔

(۴) جو آزاد کہتے ہیں کہ مصحفی کے اشعار آتش کے اشعار سے کمزور تھے۔ اس صورت میں آتش کا رویہ کتنا مذموم نظر آتا ہے کہ وہ اپنے اشعار سے کمزور اشعار کو اپنے ایک استاد بھائی کے منھ سے سُنکر تاب نہ لا سکے اور سیدھے استاد سے جا کر اڑ مرے۔

(۵) ان سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر آزاد کو آتش کا ایک مسلم الثبوت استاد سے بگاڑ دکھانا تھا تو اصولاً کوئی مستند روایت بیان کرتے! راوی کا ذکر کرتے۔ لیکن اس طرز تاریخ نویسی اور اس عقل و فہم کو ملاحظہ فرمایئے کہ ایسی مبہم روایت کو یوں تحریر فرماتے ہیں "مگر جہاں سے کھلم کھلا بگڑی اسکی حکایت یہ سُنی گئی ہے" اے سبحان اللہ یہ تو حال تھا نفس روایت کا۔ اب آزاد ہیں کہ اسکو تائید و تقویت پہنچا رہے ہیں۔ ان مرعوب کن اور احتمال انگیز الفاظ سے کہ "خدا جانے بنیاد کن کن جزئیات پر قائم ہوئی ہوگی اور حق کس کی طرف جا رہا ہوگا، آج اصل حقیقت دور کے بیٹھنے والوں پر کھلنی مشکل ہے" اللہ اکبر! جب یہ شبہات روایت بیان کرتے وقت خود ہی پیدا کر دئے جائیں تو کیوں نہ یقین کر لینے کو جی چاہے۔ اور کیوں نہ کسی آئندہ زمانہ میں کوئی صاحب اتنی گنجائش پا کر اُٹھ کھڑے ہوں کہ "جی ہاں اب معلوم ہوا۔ وہ جزئیات یہ ہیں۔ اور حق آتش کی طرف تھا" پھر یہ کہ "اصل حقیقت کھلنی مشکل ہے مگر صاحب بصیرت اور صاحب فراست ناقد کے نزدیک آسان ہے۔

**مذہب** مذہب کی بحث دیکھکر جو خیالات لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونگے۔ ہمیں اُن کا پورا علم و احساس ہے۔ پھر بھی ہم اس بحث کو چھیڑتے ہیں۔ محض اس مقصد سے کہ ایک شخص کے کلام کو پڑھکر اور تذکروں میں اُسکے حالات دیکھکر جو صحیح نتیجہ نکلتا ہو اُسکو ظاہر کیا جائے۔ بنابریں اگر مجھے آتش کے تشیع مفروضہ سے انکار ہو تو اسکی وجہ "تنگ نظری" یا "کسی مشہور شاعر کو شیعہ نہ دیکھ سکنا" نہیں۔ اور ہو بھی کیسے سکتا ہے، درآنحالیکہ ہم عُرفی و قاآنی۔ انیس و دبیر۔ سودا و ناسخ کو مشہور اور پھر شیعہ جانتے اور مانتے ہیں۔ اس کے علاوہ آتش جیسے بنگ نوش، رند و آزاد اس قابل بھی نہ تھے کہ اُن کو خلاف واقع طور پر محض زبردستی کھینچ تان سے سُنی ثابت کیا جائے نہ تسنن کو اس سے چار چاند لگ جائیں گے نہ تشیع میں کوئی بٹہ لگ جائیگا نہ ہم اس بارہ میں اوروں کی طرح تاویلات بارِدہ اور تحریفات رکیکہ کام میں لائیں گے۔ بلکہ جو کچھ از روئے تحقیق ثابت ہوگا اُسے دنیا کے سامنے پیش کریں گے۔

آزاد نے اس بیان کو بڑی ترکیب سے لکھا تھا۔ مرزا اثر صاحب نے نہ صرف اسکی تائید کردی بلکہ اسکے مشن سے دو قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔ یعنی اُس نے تو گول لفظوں میں لکھا اثر صاحب نے اس سے نتیجہ نکال کر صاف صاف لکھدیا کہ وہ شیعہ تھا حالانکہ کوئی تذکرہ حتیٰ کہ خود آزاد بھی مرزا صاحب کا ساتھ نہیں دیسکتے۔

آزاد و اثر صاحبان کی طرز تحریر اور افتادِ طبع کو دیکھکر حیران ہوں کہ تذکرہ نویسوں اور خاصکر اپنے یہاں کے تذکرہ نویسوں کی اس روش کی داد دوں یا فریاد کروں کہ یکے بعد دیگرے صدہا شعرا کا تذکرہ کرتے چلے جاتے ہیں، مگر مذہب کا حال، تفصیل تو درکنار، کوئی اشارہ تک اُسکی جانب نہیں کرتے اور نہیں کرنا چاہتے۔ معلوم نہیں یہ اُنکی فراخدلی اور رواداری تھی، یا بےخبری اور لاعلمی، بہرحال شرلیت سیرت نگاری اور مذہب ادبیات کا یہ ایک بہت بڑا گناہ تھا جو اُن سے سرزد ہوا اور میں سچ کہتا ہوں کہ انقلاب زمانہ کا دیوتا اُنکو اس گناہ پر بغیر سزا دیئے نہیں رہ سکتا تھا۔ اُسکی سزا وہ ہے جو دوسرے لوگ موقع پاکر آہستہ آہستہ اپنا کام کرتے جاتے ہیں اب صورت یہ ہے کہ ایک شخص نے آکر بنیادی اینٹ رکھدی دوسرے نے بنیاد بھروی تیسرے نے پوری عمارت اُس پر بنا کھڑی کی۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس بارہ میں "اصل حقیقت دور کے بیٹھنے والوں پر کھلنی مشکل ہے"۔ اور اگر آج بعض رسالے اور مضامین نہ شائع ہوئے ہوتے تو یقیناً ہمکو روز روشن میں رات کی تاریکی، چاند۔ ستارے سب کچھ دکھائے اور منوائے جا سکتے تھے اور اسوقت سوا ماننے کے اور چارہ ہی کیا ہوتا۔ بہرحال آتش کی شیعیت کے ذیل میں اتنی باتیں بیان کیجاتی ہیں :-

(۱) آزاد نے آبحیات صفحہ ۳۴۷ تذکرہ آتش میں ایک بات بہت پردہ پردہ میں لکھی ہے کہ "۱۲۶۳ھ میں ایک دن بھلے چنگے بیٹھے تھے۔ یکایک ایسا موت کا جھونکا آیا کہ شعلہ کی طرح بجھ کر رہ گئے۔ آتش کے گھر میں راکھ کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہوتا تھا۔ میر دوست علی خلیل نے تجہیز و تکفین کی اور رسوم ماتم بھی بہت اچھی طرح ادا کیں۔ بی بی اور ایک لڑکا لڑکی خورد سال تھی اُنکی بھی سرپرستی ہی کرتے رہے۔"

میر دوست علی خلیل آتش کے شاگرد تھے۔ اور شیعہ مذہب رکھتے تھے۔ آزاد کا مطلب غالباً یہ ہے کہ چونکہ ایک شیعہ نے تجہیز و تکفین کی لہذا آتش کی موت اور دفن و کفن وغیرہ امور شیعوں کی طرح ہوئے اور آتش شیعہ تھا۔

(۲) آبحیات میں صفحہ ۳۸۳ پر ایک روایت سے آتش کو شیعہ گردانا جاتا ہے "خواجہ صاحب کی سیدھی سادی طبیعت اور بھولی بھالی باتوں کے ذکر میں میر انیس مرحوم نے فرمایا کہ ایک دن آپ کو نماز کا خیال آگیا۔ کسی شاگرد سے کہا کہ بھئی ہمیں نماز تو سکھاؤ۔ وہ اتفاقاً فرقہ سنت و جماعت سے تھا اُس نے ویسی ہی نماز سکھادی اور یہ کہدیا کہ اُستاد! عبادتِ الٰہی جتنی پوشیدہ ہو اتنی ہی اچھی ہوتی ہے۔ جب نماز کا وقت ہوتا یہ حجرہ میں جاتے یا گھر کا دروازہ بند کرکے اُسی طرح نماز پڑھا کرتے۔ میر دوست علی خلیل انکے شاگرد خاص اور خلوت و جلوت کے حاضر باش تھے۔ ایک دن اُنھوں نے بھی دیکھ لیا، بہت حیران ہوئے۔ یہ نماز پڑھ چکے تو اُنھوں نے کہا کہ "اُستاد آپ کا مذہب کیا ہے؟" فرمایا "شیعہ۔ ہیں! یہ کیا پوچھتے ہو؟" اُنھوں نے کہا "کہ نماز سنیوں کی" فرمایا کہ "بھئی میں کیا جانوں فلاں شخص سے میں نے کہا تھا اُس نے جو سکھادی سو پڑھتا ہوں۔ مجھے کیا خبر کہ ایک خدا کی

دو دو نمازیں ہیں"۔ اُسی دن سے شیعوں کی طرح نماز پڑھنے لگے"۔

(۳) اثر صاحب نے اکتوبر کے زمانہ میں لکھا ہے "مذہب شیعہ تھا، چنانچہ خود فرماتے ہیں غزل" (اسکے بعد وہ غزل لاتحف ایدل اور شاہ نجف ایدل والی نقل کی جس کے مقطع میں یہ مصرعہ بھی ہے "شیطان کے نطفہ سے ہے وہ ناخلف ایدل")

لیکن اسکے جوابات لکھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دو باتوں کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کراؤں۔

(۱) ہم نے آجتک یہی سُنا تھا (اور نہ صرف ہم بلکہ ایک دنیا اسکو جانتی ہے) کہ شیعوں کے ہاں تصوف کوئی چیز نہیں۔ درویشی، کشف و کرامت، پیری و مریدی، فیضِ باطنی، صفائے قلب وغیرہ ان کے نزدیک ڈھکوسلے ہیں اور الفاظِ بے معنیٰ۔ یہی مینے اپنے سابق مضمون "میرزا غالب کے مذہب" میں مختصراً لکھا تھا۔ لیکن ضرورت ہے کہ آج ذرا تفصیل سے اس پر اظہارِ خیال کروں۔

سوال یہ ہے کہ شیعیت و تصوف میں تضاد ہے یا نہیں اگر تضاد ہے تو ان دونوں کا اجتماع کیا معنی اور اگر توافق ہے تو خدارا مجھے بتلائیے کہ صوفیوں کو بُرا کہنا کیا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ چمنستانِ لکھنؤ کا ایک بلبل یوں نغمہ سنج ہوتا ہے۔

این کلام صوفیانِ شوم هست ، مثنوی مولوی روم هست ،

صوفی اندر باغ چوں ہو ہو کند ، فاختہ بر حالِ او کو کو کند ،

(۲) شیعوں اور سنیوں میں بلحاظ عقائد تھوڑا ہی سا فرق ہے۔ اسلئے ہر سنی کو نہایت آسانی سے شیعہ کہا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ کچھ آج ہی نہیں قرونِ اولےٰ اور وسطیٰ میں بھی مشاہیر کا مذہب وعقیدہ مخفی یا کم از کم مشتبہ کرنیکی ہر ممکن سعی کی گئی ہے۔ روایتیں گھڑی گئیں۔ الحاقی اشعار اور جعلی رسالے شائع کئے گئے، شاہ عبد العزیز صاحب اپنے رسالہ "تحفہ" میں لکھتے ہیں کہ شیعہ ہمیشہ در پردہ اس کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ مطلب اُن کا یہ ہوتا ہے کہ آج نہ سہی تو سو پچاس برس کے بعد لوگوں کو اس کے ذریعہ سے غلط راہ پر ڈالا جا سکے۔ شاہ صاحب نے مثالیں لکھی ہیں کہ ابن قتیبہ (سنی حنفی) کی کتاب "المعارف" کے مقابلہ میں ایک شیعہ قتیبہ نے بھی المعارف کتاب لکھی۔ ایک کتاب "سر العالمین" امام غزالی کے نام سے لکھی گئی۔ تاریخ طبری اصل کمیاب ہے۔ اس کا مصنف سنی تھا۔ ایک شیعہ نے اس کے ترجمہ اور اختصار میں خاصی آمیزش کردی اور آج وہی پائی جاتی ہے"۔ اسی طرح خواجہ حافظ کے نام سے الحاقی غزلیں اور قصیدے ان کے دیوان میں داخل کئے گئے سعدی و روم کو تشیع سے منسوب کیا گیا۔ شاہ عبد العزیز صاحب کے نام سے "سر الشہادتین" لکھدی گئی۔ یہی صورت غالب میر۔ آتش کے بارہ میں بھی پیش آئی ہے اور آزاد در پردہ یہ کام کر گئے ہیں۔

باقی آیندہ

سراج الحق

---

# باب الاستفسار

## تاریخ اسلامی ہند کے اصلی ماخذ

(بہ سلسلۂ سابق)

(نگار) اسلامی تاریخ ہند کے اصل ماخذوں کے متعلق جو گفتگو گزشتہ ماہ کے رسالہ میں شروع ہوئی تھی، وہ صرف سندھ تک پہونچکر ختم ہو گئی تھی۔ آج کی صحبت میں، حملۂ غزنوی کے وقت سے حملۂ تیمور تک کی تاریخوں سے بحث کرتا ہوں لیکن یہ واضح رہے کہ ان میں بعض کتابیں ایسی بھی نظر آئیں گی۔ جو حملۂ تیمور کے بہت بعد لکھی گئیں، لیکن ان کا ذکر اس لئے ناگزیر تھا کہ اُن میں بھی شروع سے مسلمانوں کے حملے اور اُن کے قیام سلطنت ہند کے واقعات درج ہیں۔ بہر حال اس سلسلہ میں تمام وہ کتابیں نظر آئیں گی جو تاریخ اسلامی ہند کے غالب حصہ کو محیط ہیں۔ اور جن سے نہ صرف حملۂ تیمور تک کے حالات بلکہ بہت بعد کے واقعات بھی ہو سکتے ہیں۔

چونکہ تاریخ ترتیب کے لحاظ سے ان کتابوں کے ذکر میں تقدم و تاخر زحمت طلب معلوم ہوا، اس لئے ردیف وار ان کی فہرست دیکر مختصراً اُن کا ذکر کئے دیتا ہوں۔ پہلے بہ پابندی ردیف فہرست ملاحظہ ہو:۔

(۱) تاریخ آل سبکتگین (۲) تاریخ الفی (۳) تاریخ گزیدہ (۴) تاریخ فرشتہ (۵) تاریخ یمینی (۶) تاج المآثر (۷) تاریخ علائی (۸) تاریخ وصاف (۹) تاریخ حقی (۱۰) تاریخ خان جہاں لودی (۱۱) تاریخ مبارک شاہی (۱۲) تاریخ داؤدی (۱۳) تاریخ سلاطین افاغنہ (۱۴) تاریخ کامل ابن اثیر (۱۵) جوامع الحکایات (۱۶) حبیب السیر (۱۷) روضۃ الصفا (۱۸) زینت المجالس (۱۹) سفرنامہ ابن بطوطہ (۲۰) طبقات اکبری (۲۱) طبقات ناصری (۲۲) ظفرنامہ (۲۳) فیروز شاہی برنی (۲۴) فیروز شاہی سراج عفیف (۲۵) فتوحات فیروز شاہی (۲۶) مآثر رحیمی (۲۷) مراۃ مسعودی (۲۸) مسالک الابصار (۲۹) مطلع سعدین (۳۰) منتخب التواریخ (۳۱) ملفوظات تیموری (۳۲) نگارستان (۳۳) واقعات مشتاقی۔

---

۱۔ "تاریخ آل سبکتگین" کو تاریخ بیہقی اور مجلدات بیہقی بھی کہتے ہیں، کیونکہ اس کے مولف کا نام ابو الفضل

بن الحسن البیہقی تھا۔ یہ تاریخ تقریباً ناپید ہے۔ اور چند اجزاء اس کے کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ میر خوند نے روضۃ الصفا میں لکھا ہے کہ اسکی تیس جلدیں تھیں۔ تاریخ گزیدہ میں بھی اس کتاب کا حوالہ پایا جاتا ہے اور ضیاء برنی وابوالفضل نے امام بیہقی کا ذکر کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک اس شہاب کا وجود باقی تھا۔ فرشتہ نے بھی محمود غزنوی کے حالات میں اس کتاب کا حوالہ دیا ہے، لیکن اُس نے خود غالباً اس کتاب کو نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ محمود کے حالات لکھنے میں اتنی خامیاں باقی نہ رہتیں۔ خاندان غزنوی کے حالات میں اس سے زیادہ جامع ومکمل تاریخ کوئی نہیں لکھی گئی۔ اس کتاب میں فرخ زاد جمال الدولہ یعنی ۴۵۱ھ تک کے حالات پائے جاتے ہیں۔ چونکہ خود اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴۰۲ھ میں اس کی عمر سولہ سال کی تھی۔ اس لئے اگر اسی عمر سے اُس نے اپنی تاریخ لکھنی شروع کی تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اُس نے محمود غزنوی کے حالات سے ابتدا کی تھی کیونکہ محمود نے ۳۸۸ھ سے ۴۲۱ھ تک حکومت کی۔

تاریخ وصاف سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے امیر ناصر الدین سبکتگین کے حالات میں ایک اور کتاب تاریخ ناصری کے نام سے بھی لکھی تھی۔ مگر ممکن ہے کہ یہ تاریخ کوئی علیحدہ کتاب نہ ہو، بلکہ صرف حالات سبکتگین کے حصہ کا نام تاریخ ناصری رکھدیا ہو، جیسا محمود کے حالات کا حصہ اُس نے تاج الفتوح کے نام سے موسوم کیا تھا، جیسا کہ قصائد عنصری سے معلوم ہوتا ہے۔

۲- تاریخ الفی۔ عربی میں الف ہزار کو کہتے ہیں۔ اس کا نام تاریخ الفی اس لئے قرار پایا کہ جب ۱۰۰۰ھ ختم ہوا تو اکبر نے حکم دیا کہ آج کے دن تک کے تمام شاہان اسلام کا مفصل حال درج کیا جائے اور اس کا نام تاریخ الفی رکھا جائے۔ اسی کے ساتھ یہ حکم بھی دیا کہ واقعات رحلت نبوی کے بعد سے لکھے جائیں اور سنین کے ذکر میں بجائے ہجرت کے لفظ رحلت لکھا جائے۔

اس خدمت کے لئے سات آدمی مامور ہوئے، پہلا سال نقیب خاں کو سپرد کیا گیا، دوسرا شاہ فتح اللہ کو، اسیطرح حکیم ہمام، حکیم علی، حاجی ابراہیم سندھی، مرزا نظام الدین اختر اور ملا عبدالقادر بدایونی کو۔ جب ۳۵ سال کے حالات مرتب ہو گئے تو حکیم ابوالفتح کی سفارش سے یہ کام ملا احمد کے سپرد کیا گیا۔ جب چنگیز خاں تک کے حالات وہ دو جلدوں میں ختم کر چکا تو مرزا فولاد نے اُسے لاہور کی ایک گلی میں قتل کر دیا۔ اس کے بعد ۹۹۷ھ تک کے حالات آصف خاں نے مرتب کئے۔

تاریخ الفی اس میں شک نہیں کہ عہد اکبری کی بہترین تصانیف میں سے ہے، لیکن چونکہ اس کی ترتیب مختلف ذوق وخیال کے ماتحت ہوئی ہے، اس لئے کہیں کہیں اصل واقعات میں تحریف بھی کی گئی ہے۔ علاوہ اس کے یاد چونکہ وہ فسانہ کی صورت میں لکھی گئی ہے۔ اس لئے واقعات کا استقصاء بھی اس میں دشوار ہے۔ حیدرآباد اور رامپور

کے کتب خانوں میں اس کے ناتمام نسخے موجود ہیں۔

۳- تاریخ گزیدہ- ۷۳۰ھ میں مرتب ہوئی اس کا مولف حمد اللہ بن ابو بکر بن حمد بن نصر مستوفی قزوینی تھا۔ یہ رشید الدین کے بیٹے غیاث الدین (وزیر) کا سکرٹیری تھا اور اسی کے نام سے یہ کتاب منسوب ہے۔

اس کتاب کا شمار مشرق کی بہترین تاریخوں میں ہے- اس کتاب کے ماخذ یہ ہیں:- تاریخ طبری- تاریخ کامل ابن اثیر، نظام التواریخ بیضاوی، زبدۃ التواریخ، جمال الدین کاشی، اور جہاں کشا جوینی۔

۴- تاریخ فرشتہ عام طور پر ہندوستان کی بہترین تاریخ تسلیم کیجاتی ہے- اس کا مصنف محمد قاسم ہندو شاہ بمقام استر آباد ۱۵۷۰ء میں پیدا ہوا- بعض نے تاریخ پیدائش ۱۵۵۰ء بتائی ہے- اس کا باپ غلام علی ہندو شاہ مرتضےٰ نظام شاہ کے عہد میں احمد نگر پہونچا اور حضور رس ہوگیا- محمد قاسم اُسوقت کمسن تھا- جب غلام علی مرگیا- تو محمد قاسم کو اس کی جگہ دربار میں ملی- جب میر ابن حسین فرمانروائے احمد نگر قتل کیا گیا تو محمد قاسم کو بھی بھاگنا پڑا اور بیجا پور میں ابراہیم عادل شاہ نے تاریخ دکن کی ترتیب پر مامور کیا- ۱۶۰۶ء میں تاریخ مرتب ہو گئی، لیکن اس کے بعد وہ ہمیشہ اس کی صحت و ترمیم کرتا رہا- برگس (BRIGGS) کا خیال ہے کہ ۱۶۱۲ء میں اس کا انتقال ہوا، حالانکہ ۱۶۲۳ء تک کے واقعات اس کی تاریخ میں پائے جاتے ہیں، تاریخ فرشتہ کا نام، ابراہیم عادل شاہ کے نام کی رعایت سے گلشن ابراہیمی یا تاریخ ابراہیمی رکھا گیا- اور بعد کو جب ابراہیم نے پایۂ تخت نورس بنایا تو اس کی یادگار میں اس کا دوسرا نام نورس نامہ بھی قرار پایا۔

دکن کی تاریخ کا جہاں تک تعلق ہے، یہ تاریخ نہایت عمدہ ہے لیکن کہیں کہیں مذہبی عصبیت ضرور نمایاں ہو گئی ہے۔

۵- تاریخ یمینی- اس کا مصنف ابو نصر محمد ابن محمد الجبار العتبی تھا، اس کا خاندان سامانی بادشاہوں کے عہد میں بہت ممتاز سمجھا جاتا تھا اور یہ خود محمود غزنوی کا سکرٹیری تھا- اس نے سبکتگین کے پورے حالات اور محمود کے واقعات سلطنت ۴۱۰ھ تک درج کئے ہیں۔

یہ کتاب ادبی نقطۂ نظر سے بھی خاص چیز خیال کی جاتی ہے- فارسی میں بھی اس کے متعدد ترجمے ہوئے [illegible] سے پہلے ترجمہ ۵۸۲ھ میں ہوا تھا اور دوسرا ترجمہ محمد کرامت علی دہلوی نے کیا- جو مختلف کتب خانوں میں نظر آتا ہے۔

۶- تاج المآثر- قطب الدین ایبک کے حالات معلوم کرنے کا تنہا ذریعہ تھا جس سے مورخین مابعد نے کام لیا- اور بقول ہمیر" اگر حسن نظامی (مولف تاج المآثر) قطب الدین کے حالات نہ لکھتا تو آج یہ بھی گمنام حالت میں رہتا۔

اس کے مؤلف کے حالات زندگی بہت کم معلوم ہیں۔ تاج المآثر کے دیباچہ میں اُس نے اپنا نام حسن نظامی لکھا ہے۔ میر خوند نے اس کا پورا نام صدر الامین محمد بن حسن نظامی تحریر کیا ہے۔ ابو الفضل نے بھی آئینِ اکبری میں یہی نام درج کیا ہے۔

ہمیرپر گستاں نے اسے باشندۂ لاہور ظاہر کیا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ وہ نیشاپور کا رہنے والا تھا۔ دہلی پہونچکر وہ شرف الملک قاضی شہر سے ملا اور چند دن بعد ۶۰۲ھ میں یہ تاریخ لکھنا شروع کی۔ اسی سال شہاب الدین محمد غوری کا انتقال ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جبوقت اُس نے اس تاریخ کی ابتدا کی، محمد غوری زندہ تھا، اور اسی لئے اسکے نام سے یہ کتاب منسوب کی گئی۔

ہمیر لکھتا ہے کہ قطب الدین ایبک کی وفات کے بارہ سال بعد تاج المآثر مرتب ہوئی۔ اور اس کتاب کو محمد بن سام بن حسین فرمانروائے لاہور سے منسوب کیا۔

ہمیر نے محمد کو محمد بن سام لاہوری سمجھا، حالانکہ اس سے مراد محمد غوری تھی۔ اس لئے ہمیر کی پہلی تحقیق بھی غلط ہے۔

اس تاریخ کی ابتدا ۵۸۷ھ سے شروع ہوتی ہے۔ جب محمد غوری اپنی شکست تھانیسر کا انتقام لینے کے لئے حملۂ ہند کی طیاریاں کر رہا تھا۔ عام طور پر جو نسخے اس کتاب کے ملتے ہیں ان میں ۶۱۴ھ (قطب الدین ایبک کے سات سال بعد) تک کے حالات درج ہیں۔ لیکن بعض نسخوں میں ۶۲۶ھ (شمس الدین التمش کے زمانہ) تک کے حالات پائے جاتے ہیں۔ قطب الدین ایبک کے جو حالات اس میں پائے جاتے ہیں، وہ غیر اہم بھی ہیں اور کم بھی۔ اس تصنیف کی حیثیت تشبیہات و استعارات، صنائع و بدائع کی وجہ سے زیادہ تر ادبی ہے جس سے اسکی مورخانہ اہمیت کو صدمہ پہونچا ہے۔

۷۔ تاریخ علائی۔ اس کا دوسرا نام خزائن الفتوح بھی ہے۔ یہ امیر خسرو کی تصنیف ہے۔ جس میں عہد علاؤالدین خلجی کے ابتدائی و درمیانی حالات درج ہیں۔

علاوہ اس کے دو کتابیں تاریخ کی اُنھوں نے اور لکھی تھیں۔ ایک تاج الفتوح (سلطان جلال الدین عہد حکومت کا اول دو سال کی تاریخ) اور دوسری تغلق نامہ (جسمیں غیاث الدین تغلق کے حالات درج تھے۔

۸۔ تاریخ وصاف۔ اس کا اصل نام "تزجیۃ الاخبار و تجزیۃ الآثار" ہے۔ عبداللہ بن فضل اللہ شیرازی المعروف بہ وصاف اس کا مصنف تھا۔ شعبان ۶۹۹ھ میں یہ کتاب ختم ہوئی اور اسوقت پہلی چار جلدیں شائع بھی ہوگئیں کیونکہ رشید الدین نے اپنی مشہور کتاب جامع التواریخ میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ اس کے بعد مصنف نے ایک جلد اور لکھی جس میں ۷۲۸ھ تک کے واقعات درج کئے۔ اس کتاب میں اُس عہد سے ترتیب واقعات کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ جب تاریخ جہاں کشا کی ترتیب ختم ہوئی۔ یعنی منگو خاں کے انتقال اور قبلائی خاں کی ــــــــ تخت نشینی سے اسکی

ابتدا ہوتی ہے۔ یہ کتاب مغلوں کی نہایت معتبر تاریخ سمجھی جاتی ہے۔ تیسری اور چوتھی جلد میں اُس نے ہندوستان کے کچھ حالات درج کئے ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ اُس نے بہت کاوش سے کام لیا ہے۔

۹۔ تاریخ حقی۔ اس کے مولف مولانا عبدالحق بن سیف الدین دہلوی تھے۔ اس میں سلاطین غلام سے لیکر اکبر تک کے حالات درج ہیں۔ یہ کتاب ۱۰۰۵ھ میں مرتب ہوئی جب اکبر کی تخت نشینی کا بیالیسواں سال تھا۔

مصنف کا بیان ہے کہ تاریخ لکھنے کا شوق انھیں ضیاء برنی کی تاریخ فیروز شاہی کو دیکھکر پیدا ہوا۔ چونکہ تاریخ فیروز شاہی میں صرف فیروز شاہ تک کے حالات درج تھے اس لئے بعد کے حالات اُنھوں نے تاریخ بہادر شاہی (مصنفہ سام سلطان بہادر گجراتی) سے مدد لیکر لکھے اور بہلول لودی تک کی تاریخ مرتب کی۔ اس کے بعد یہ خیال پیدا ہوا کہ اُن بادشاہوں کا بھی حال لکھنا چاہئے جن کو ضیاء برنی چھوڑ گیا ہے۔ اس غرض سے اُنھوں نے طبقات ناصری سے مدد لیکر فخر الدین سام (محمد غوری) کے حالات سے اپنی تاریخ کو شروع کیا۔ بہلول لودی سے لیکر عہد اکبری تک کے حالات اُنھوں نے زیادہ تر زبانی روایات اور اپنی ذاتی معلومات کی بناء پر لکھے۔

اُنھوں نے سلاطین بنگال۔ جونپور۔ مانڈو۔ دکن، ملتان، سندھ و کشمیر کے حالات بھی لکھے ہیں، لیکن نہایت مجمل۔

یہ کتاب بہت کمیاب ہے، اور ہندوستان میں اُس کے قلمی نسخے کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ ایک نسخہ برٹش میوزیم میں بھی ہے اور ایک رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں۔

۱۰۔ تاریخ خان جہاں لودی۔ اسی کتاب کا دوسرا نام مخزن افاغنہ بھی ہے۔ جن لوگوں نے مخزن افاغنہ کو علحدہ کتاب سمجھا ہے۔ ان دونوں میں سوائے اس کے کوئی فرق نہیں کہ جب مخزن افاغنہ پر دوبارہ نظر ثانی کی تو وہ تاریخ خان جہاں لودی بن گئی (خاں جہاں، جہانگیر کا مشہور سپہ سالار تھا) جہانگیر کے بھی مختصر حالات اس کتاب میں شامل ہیں۔ اس کا مصنف نعمت اللہ دربار جہانگیر کا وقائع نویس تھا۔ اس کا باپ خواجہ حبیب اللہ ہراتی تھا۔ اس کتاب کی ترتیب ۱۰۲۱ھ میں ختم ہوئی۔

۱۱۔ تاریخ مبارک شاہی۔ اس کا مصنف یحییٰ بن احمد بن عبداللہ سرہندی تھا۔ چونکہ مصنف کا مقصود مبارک شاہ ثانی (سید خاندان کے حکمراں) کے مفصل حالات درج کرنا تھا۔ اس لئے اسکا نام اسنے تاریخ مبارک شاہی رکھا۔ اس کی ابتدا، محمد سام (غوری) کے زمانہ سے ہوتی ہے اور جو قلمی نسخہ اس کا دستیاب ہوا ہے۔ اس میں صرف ۸۵۲ھ تک کے حالات درج ہیں (جو سلطان سید محمدؒ کے حکومت کا درمیانی زمانہ تھا) اس لئے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اُس کے بعد اُس نے کس عہد کے حالات لکھے تھے۔

فیروز شاہ تک کے حالات اس نے دوسری تاریخوں کی مدد سے لکھے ہیں۔ اور بعد کے واقعات اس نے

معتبر روایات اور اپنے مشاہدہ کی بناء پر تحریر کیے ہیں۔ اُس نے خود اپنا کوئی حال نہیں لکھا۔ اس لئے یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ وہ کیا تھا اور دربار مبارک شاہ سے اسے کیا تعلق تھا۔

سید خاندان کی تاریخ اس سے بہتر کوئی نہیں ہے۔ اور نظام الدین احمد نے طبقات اکبری میں، ہندو شاہ نے فرشتہ میں اور ملا عبدالقادر نے اپنی منتخب التواریخ میں اس سے بہت مدد لی ہے۔

۱۲- تاریخ داؤدی۔ اس کا مصنف عبداللہ تھا۔ غالباً عہد جہانگیر کے اولیں سال تخت نشینی میں مرتب کی گئی۔ بہلول لودی سے ابتدا کی ہے اور داؤد شاہ پر اس کا اختتام ہوا ہے۔ ضبط واقعات کے لحاظ سے اس کتاب کا کوئی خاص درجہ نہیں ہے، لیکن سلاطین افاغنہ کے خصائل و عادات پر بہت کافی روشنی اس میں ڈالی گئی ہے۔ اس کے مصنف نے اپنے حالات نہیں لکھے اور نہ تاریخ ترتیب کا پتہ چلتا ہے۔

۱۳- تاریخ سلاطین افاغنہ۔ اس کا مصنف احمد یادگار تھا، جو شاہان سُور کا دیرینہ خادم تھا۔ داؤد شاہ کے حکم سے اُس نے یہ تاریخ لکھی، جس میں بہلول لودی کے وقت سے ابتدا کی گئی، اور ہیمو کے واقعۂ قتل پر اس کا اختتام ہوا۔ اس کی صحیح تاریخ تصنیف کہیں درج نہیں ہے۔ لیکن چونکہ داؤد شاہ کے حکم سے اس کی ترتیب ہوئی تھی۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ۹۸۲ھ سے قبل مرتب ہوئی ہوگی۔ تاریخی حیثیت سے یہ کتاب زیادہ اہم نہیں ہے۔

۱۴- تاریخ کامل ابن اثیر۔ عربی کی بہت مشہور تاریخ ہے۔ اور تقریباً ہر شخص اس سے واقف ہے۔ زیادہ صراحت کی ضرورت نہیں۔ ہندوستان کے متعلق۔ غزنوی و غوری سلاطین کا حال اس نے بہت خوبی سے درج کیا ہے۔

حبیب السیر کا مصنف لکھتا ہے کہ اس کا ترجمہ تیمور کے بیٹے میران شاہ کے حکم سے نجم الدین زراری نے (جو میران شاہ کا کاتب خصوصی تھا۔) فارسی میں کیا تھا۔

۱۵- جوامع الحکایات۔ اس کا پورا نام "جوامع الحکایات و لوامع الروایات" ہے۔ اس کا مصنف نورالدین محمد عوفی تھا (وہی عوفی جس کا تذکرہ لباب الالباب، مسٹر براؤن نے بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا)

یہ کتاب نظام الملک محمد (وزیر التمش) کے نام سے منسوب ہے۔ اسی کتاب میں صرف ان تاریخی حکایات کو جمع کیا گیا ہے۔ جن سے شاہان اسلام کے اخلاق و عادات پر روشنی پڑتی ہے۔ مصنف نے جن کتابوں سے مدد لیکر یہ کتاب مرتب کی ہے، اُن کے نام یہ ہیں:-

تاریخ یمینی، تاریخ ناصری، تاریخ ملوک عجم، مجمع الامثال، عیون الاخبار، شرف النبی، فرج بعد الشدت، خلق الانسان، اخبار المکہ وغیرہ۔

۱۶- حبیب السیر۔ خوندمیر کی دوسری تاریخ ہے۔ اس سے قبل وہ خلاصۃ الاخبار لکھ چکا تھا، لیکن چونکہ وہ مجمل تھی، اس لئے اس نے دوسری مفصل تاریخ حبیب السیر کے نام سے لکھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس کتاب

کی ترتیب میں روضۃ الصفا سے کافی مدد لی گئی ہے۔ لیکن بعض ایسے خاندانوں کا بھی حال اس میں درج ہے جو روضۃ الصفا میں نہیں ہیں۔ ۹۲۷ھ میں اس کی ترتیب شروع ہوئی تھی۔ اختتام کی صحیح تاریخ متعین نہیں ہو سکتی۔ تاہم بعض نسخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹۳۵ھ میں ختم ہوئی۔ اس کا مکمل نسخہ اس وقت کہیں نہیں ملتا۔ منتشر اجزاء مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔

۱۷۔ روضۃ الصفا۔ اس کتاب کا پورا نام یہ ہے :- "روضۃ الصفا فی سیرۃ الانبیاء والملوک والخلفاء" اس کا مصنف محمد بن خاوند شاہ بن محمود۔ زیادہ تر میر خاوند اور میر خوند کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے ابتدائی حالات تاریکی میں ہیں۔ ۸۳۷ھ میں پیدا ہوا۔ اور ۹۰۲ھ میں انتقال کیا۔ میر علی شیر (سلطان حسین شاہ ایران کا وزیر) اس کا سرپرست تھا اور اسی کے زمانہ میں اُس نے یہ تاریخ مرتب کی۔

روضۃ الصفا نہایت معتبر تاریخ ہے اور بعد کے مورخین نے اس سے بہت استفادہ کیا ہے۔ اور حاجی خلیفہ کی تاریخ تو بالکل اسی کا اقتباس ہے۔

۱۸۔ زینت المجالس۔ اس کی تاریخ تالیف ۱۰۰۴ھ ہے۔ اس کے مولف کا نام مجد الدین محمد الحسنی تھا۔ لیکن عام طور پر مجدی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مختلف قصص و حکایات کا مجموعہ ہے اور تاریخی اہمیت سے معرّا۔

۱۹۔ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ بہت مشہور کتاب ہے۔ ابن بطوطہ ۷۳۴ھ میں بعہد سلطان محمد تغلق آیا تھا۔ اُس نے اپنے سفرنامہ میں سلطان محمد تغلق کے حالات نہایت تفصیل سے درج کئے ہیں۔

۲۰۔ طبقات اکبری۔ اس کا صحیح نام طبقاتِ اکبر شاہی ہے اور مصنف کے نام کی رعایت سے تاریخ نظامی بھی کہتے ہیں۔ اس کا مصنف خواجہ نظام الدین احمد خواجہ مقیم ہروی (بابر کا ندیم و مصاحب) تھا۔ خواجہ نظام الدین عہد اکبری کے بہت ممتاز لوگوں میں تھا۔ صوبہ گجرات میں بخشی گری کے عہدہ پر بھی ممتاز رہا اور خود مختلف جنگوں میں حصہ لیا۔ ۱۰۰۲ھ میں اس کا انتقال ہوا۔

یہ کتاب ہندوستان کی نہایت مشہور و مستند تاریخوں میں سے ہے اور بعد کے تمام مورخین نے اس سے استفادہ کیا ہے۔

۲۱۔ طبقات ناصری۔ یہ کتاب ناصر الدین محمود کے نام سے منسوب ہے اور اس کی تخت نشینی کے بعد ۱۵ سال تک کے حالات اس میں درج کئے گئے ہیں۔ اس کے مصنف کا نام منہاج الدین عثمان بن سراج الدین جوزجانی تھا اور عام طور پر منہاج السراج کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ۶۲۴ھ میں غور سے سندھ اور ملتان آیا اور اوچ میں دار العلوم فیروزی کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ دوسرے سال سلطان شمس الدین التمش کے حضور میں باریاب ہوا۔ محاصرہ گوالیار کے وقت، وہ یہاں کے محکمۂ قضا کا صدر اعظم بنایا گیا۔ بہرام شاہ کے عہد میں وہ قاضی القضاۃ مقرر ہوا۔

اس کے بعد ۶۴۳ھ میں ناصریہ دار العلوم کا مہتمم اعلےٰ مقرر ہوا۔ ناصر الدین محمود کے عہد میں اسکی بڑی عزت ہوئی۔ ہندوستان کی نہایت معتبر تاریخوں میں اسکا شمار ہوتا ہے۔

۲۲۔ ظفر نامہ۔ اس کا مصنف شرف الدین یزدی تھا۔ اس کا انتقال ۸۵۰ھ میں ہوا۔ اس کتاب میں بالکل تیمور کے حالات درج ہیں۔ اور میر خوند کے نزدیک اس کا شمار بہترین تاریخوں میں ہے۔ یہ کتاب ۸۲۷ھ میں لکھی گئی اور ملفوظات تیموری سے اس کی تحریر میں اسقدر مدد لی گئی کہ اگر ہم چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ظفر نامہ ملفوظات تیموری کی دوسری صورت ہے۔

۲۳۔ فیروز شاہی برنی۔ ضیاء الدین برنی کی بہت مشہور تاریخ ہے۔ یہ کتاب طبقات ناصری کے بعد لکھی گئی۔ اس میں غیاث الدین بلبن سے لیکر فیروز شاہ تغلق تک کے حالات درج ہیں۔ چونکہ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں یہ کتاب مرتب کی گئی تھی۔ اس لئے اس کے نام سے منسوب کی گئی۔ ہر چند خود فیروز شاہ کے حالات اس میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس کتاب میں مسلسل واقعات کا لحاظ کم رکھا گیا ہے۔ تاہم اس حیثیت سے کہ سوائے اس کے اور کوئی کتاب اس عہد کی تاریخ کی نہ تھی۔ اس کی بہت قدر کی گئی۔ ضیاء برنی امیر خسرو کے مزار کے قریب ہی دہلی میں مدفون ہوا۔

۲۴۔ فیروز شاہی سراج عفیف۔ فیروز شاہ کے حالات میں اُس سے بہتر کوئی تاریخ نہیں ہے۔ اسمیں اس کے آئین جہانداری، رعایا کے حالات اور نظم ونسق سے بھی بحث کی ہے۔ شمس سراج عفیف (اس کا مصنف) ابوہر کا رہنے والا تھا (فیروز شاہ کی ماں بھی اسی گاؤں کی تھی) عفیف کا دادا ابوہر میں وصولی خراج کا افسر تھا یہ کتاب تقریباً نایاب ہے۔ لوہارو کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ اور الیٹ نے اس سے فایدہ اُٹھایا تھا۔

۲۵۔ فتوحات فیروز شاہی۔ اس کتاب میں خود فیروز شاہ نے اپنے حالات، اور اپنے زمانہ کی اصلاحات کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب ہر چند مختصر ہے، لیکن معلومات کے لحاظ سے بے مثل ہے۔ فیروز آباد کی جامع مسجد میں فیروز شاہ نے ایک ہشت پہل گنبد بنوایا تھا، اور اس کے ہر پہلو پر اس کتاب کا ایک باب نقش کرا دیا تھا اس کا ایک قلمی نسخہ مسٹر ٹامس کے پاس ۱۱۳۹ھ کا لکھا ہوا موجود تھا۔ جس سے الیٹ نے فائدہ اُٹھایا۔

---

۲۶۔ مآثر رحیمی۔ اس کا مصنف محمد عبد الباقی الرحیمی النہاوندی تھا، یہ عہد اکبری کے خاص لوگوں میں سے تھا اور عبد الرحیم خانخاناں کے متوسلین خصوصی میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اس تاریخ میں سلاطین دہلی کی تاریخ کے ساتھ عہد اکبری کے امراء و ملوک کے حالات بہت تفصیل سے درج کئے ہیں خصوصیت کے ساتھ

عبدالرحیم خانخاناں کے حالات اس قدر شرح و بسط کے ساتھ لکھے ہیں کہ بعض نے اُس کو خانخاناں ہی کی سیرت قرار دیدیا اور اسی کے نام سے منسوب ہے۔

۲۷- مرأۃ مسعودی - اس کے مصنف کا نام عبدالرحمن چشتی تھا۔ جہانگیر کے عہد میں کتاب مرتب ہوئی۔ اس میں سپہ سالار مسعود غازی کے حالات بہت ہیں۔ تاریخی حیثیت اس کتاب کی کچھ نہیں ہے۔

۲۸- مسالک الابصار - شہاب الدین ابوالعباس احمد دمشقی کی تصنیف ہے جو ۶۹۷ھ میں پیدا ہوا اور ۷۴۹ھ میں بمقام دمشق مرا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اس تاریخ کی ۲۰ جلدیں تھیں اور محمد تغلق کے حالات نہایت معتبر ذرائع سے فراہم کرکے لکھے تھے۔ یہ کتاب نایاب ہے۔

۲۹- مطلع السعدین - اس کتاب کا پورا نام "مطلع السعدین و مجمع البحرین" ہے۔ مصنف کا نام کمال الدین عبدالرزاق بن جلال الدین اسحاق السمرقندی تھا۔ اس کتاب کی پہلی جلد میں تیمور کے مفصل حالات ہیں اور دوسری جلد میں اولاد تیمور کی تاریخ ہے۔ یہ تاریخ کمیاب ہے۔

اس کا تعلق شاہ رخ کے دربار سے تھا اور اس کو شاہ بیجاپور کے پاس سفیر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ ۸۱۶ھ میں پیدا ہوا اور ۸۸۷ھ میں وفات پائی۔

۳۰- منتخب التواریخ - اس کا مصنف ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔ اس کو تاریخ بدایونی بھی کہتے ہیں اس کتاب میں عہد غزنوی سے لیکر اکبر کے ۴۰ سال تک کے واقعات درج کئے ہیں۔ عہد اکبر کی یہ مستند تاریخ سمجھی جاتی ہے۔ لیکن چونکہ اکبر کے درباریوں سے اسے نفرت تھی اور نہایت متعصب سنی تھا۔ اس لئے اسکی بیجا نکتہ چینیوں نے کتاب کو پایۂ اعتبار سے گرا دیا ہے۔

ملا عبدالقادر بڑا فاضل شخص تھا اور اسنے متعدد عربی اور سنسکرت کی کتابیں فارسی میں ترجمہ کی تھیں۔

۳۱- ملفوظات تیموری - اس کا دوسرا نام تزک تیموری بھی ہے۔ خود تیمور اس کا مصنف ہے۔ یہ ترکی زبان میں تھی جسے ابوطالب حسینی نے فارسی میں ترجمہ کرکے شاہجہاں سے منسوب کیا۔ تاریخ کے لحاظ سے اس کتاب کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

۳۲- نگارستان - مجموعہ ہے مختلف حکمران خاندانوں کے متعلق مختلف قصص و حکایات کا۔ اس کا مصنف احمد بن محمد بن عبدالغفور الغفاری القزوینی تھا۔ نگارستان اس کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۹۵۹ھ میں لکھی گئی تھی۔

۳۳- واقعات مشتاقی اسکا مولف شیخ رزق اللہ مشتاقی تھا۔ یہ ۸۹۷ھ میں پیدا ہوا۔ اور ۹۸۹ھ میں مرا۔ یہ شخص بہت بڑا سیاح تھا۔ فارسی میں مشتاق تخلص کرتا تھا اور ہندی میں راجن۔ اس کتاب میں سلطان بہلول

لودہی کے وقت سے ابتدا کی گئی ہے۔ اور سلسلہ وار عہد اکبری تک کے حالات لکھ کر، شیر شاہ، اسلام شاہ، محمود علی، غیاث الدین خلجی (مالوہ) اور مظفر شاہ (گجرات) کے حالات پر کتاب کو ختم کر دیا گیا ہے۔ یہ کتاب بہت نایاب ہے۔

---

آپ کے استفسار کا جواب تو مکمل ہو گیا، لیکن جی چاہتا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ تاریخ کتب پر بھی تبصرہ کیا جائے۔ جس کو میں کسی آئندہ فرصت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔

---


# کاجل - سُرمہ - چورن - منجن

**نوٹ** - سب چیزیں منگانیوالوں کو محصول ڈاک معاف

صرف یہ چار چیزیں میرے پاس ہیں اور اگر آپ اعتبار کریں تو میں کہوں کہ انمیں سے ہر ایک چیز تو بے ۳۰ سال سے میرے خاندان کے تجربہ میں آ رہی ہیں

**کاجل** - جو نہایت محنت سے تیار کیا جاتا ہے اور جو آنکھوں کے تمام امراض کیلئے بیحد مفید ہے سلائی لگاتے ہی ٹھنڈک پہنچتی ہے جنکی آنکھیں آشوب کرتی رہتی ہیں یا میلی ہو جاتی ہیں۔ یا سرخی پیدا ہو جاتی ہو یا نزلہ کا پانی آتا رہتا ہو یا ضعف بصارت پیدا ہو چلا ہو۔ انکے لئے روزانہ رات کو ایک سلائی لگا لینا چند دنوں میں تمام شکایتیں دور کر دیتا ہو۔ ایک ڈبیہ جو ایک شخص کیلئے سال بھر کو کافی ہو۔ قیمت عہ علاوہ محصول۔

**سُرمہ** یہ بیش بہا سُرمہ ۴۰ دنمیں تیار ہوتا ہو۔ اسمیں نہ ممیرہ ہو، نہ کوئی جواہر بلکہ معمولی سُرمہ ہو۔ جسکو جڑی بوٹیوں کے عرق میں پیسکر تیار کیا جاتا ہو اسکے فوائد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہو کہ جالا، دھند، موتیا بند، اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہو اور بارہا آزمایا ہوا ہو۔ قیمت فی پڑیا عمر علاوہ محصول

**چورن** یہ وہ اکسیری چیز ہے، جس کا ہر گھر میں رہنا ضروری ہو، پیٹ کا درد، قبض، نفخ، ریاح کا پیدا ہونا، سوء ہضم دستوں کا آنا سب یک لخت اسکے استعمال سے دور ہو جاتا ہو، کیسا ہی شدید درد پیٹ میں ہو فوراً ایک چٹکی کھانے سے جاتا رہتا ہے قیمت فی ڈبہ ۲ تولہ عمہ علاوہ محصول

**منجن** اس کی ادنیٰ خوبی یہ ہے کہ ہلتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں۔ قیمت فی ڈبہ ۲ تولہ عہ علاوہ محصول

(ایڈیٹر صاحب نگار نے خود ان دواؤں کا اطمینان کر کے اپنی رائے انکے مفید ہونے پر اکتوبر کی ملاحظات میں ظاہر کی ہے)

## م۔ بیگم نمبر ۴۲ نظیر آباد لکھنؤ

# کہکشاں کے اُسطرف

علم الافلاک یا علم ہیئت حقیقتاً بہت مشکل علم ہے اور جب وقت نظر سے کام لیا جاتا ہو تو اسکی مشکلات اور زیادہ بڑھجاتی ہیں۔ اس لئے کہ اس علم کی بنیاد ریاضی اور طبیعت کے دقیق ترین قوانین پر رکھی گئی ہے۔ لیکن بایں ہمہ یہ عجیب بات ہے کہ یہی وہ سب سے پہلا وہ علم ہے جس کے قواعد کو انسان نے ابتدا میں مقرر کیا۔ اور یہی وہ دقیق ترین علم ہے۔ جہاں انسانی معارف جا کر ملتے ہیں، اور یہی وہ پیچیدہ اور دشوار علم ہے، جس کے حقائق و معارف کے انکشاف میں بڑے بڑے علمائے فن مصروف بحث و تجسس ہیں۔ ذیل کی سطروں میں فلکیات کی ایک تازہ بحث درج کیجاتی ہے جو کائنات کی وسعت اور اس کے خالق کی عظمت کو پوری طرح ظاہر کرتی ہے۔ علماء فلک کو تحقیقات سے یہ معلوم ہوا کہ فضا میں بہت سے عالم ہیں اور اُنمیں کی ہر دنیا وسعت اور عظمت کے لحاظ سے اس کہکشاں کے مانند ہے جس پہ ہمارا نظام شمسی چل رہا ہے، علامہ ایجنٹین ماہر فلکیات کا خیال ہے کہ فضا کی غیر معمولی وسعت میں تقریباً ایک ارب دنیائیں موجود ہیں۔ اب قادر اعظم کی قدرت پر غور کرو اور دیکھو کہ اُس کے مقابلہ میں ہماری دُنیا کتنی چھوٹی ہے؟

قدماء کو یہ معلوم تھا کہ قبہ فلک میں آفتاب، ماہتاب اور تاروں کے علاوہ دوسرے اجرام بھی ہیں، جن لوگوں نے صاف اور بے غبار راتوں میں آسمانی حالات کا مطالعہ کیا تھا، ان کو کوکبۂ جبار اور کوکبۂ مراۃ المسلسلہ کے قریب وہ روشن اور درخشاں ابر کے سے ٹکڑے نظر آئے تھے۔ جن کو آج سدیم سے تعبیر کیا جاتا ہے، علامہ ابو الحسن صوفی مشہور ماہر فلکیات لکھتے ہیں کہ میں نے مراۃ المسلسلہ کی سدیم کو دیکھا ہے، علامہ کی زبان میں سدیم کا نام "لطخۂ سحابیہ" ہے، ممدوح نے جہاں کہیں بھی ان حقائق کا تذکرہ فرمایا ہے۔ لطخہ یا سحابی جیسے کلمات استعمال کئے ہیں، لیکن بایںہمہ ان اجرام کی واقعی حقیقت اُسوقت تک فہم انسانی کے نزدیک ایک راز سربستہ اور عقدہ لاینحل رہی جب تک کہ ٹیلیسکوب (دوربین) ایجاد نہ ہوئی۔

گلیلیو نے سب سے پہلے دوربین کا سر ایجاد کی، اور اس کی وساطت سے کہکشاں کا مطالعہ کیا تو اس کو یہ ثابت ہوا کہ وہ حقیقت میں تاروں کا مجموعہ ہے، اور اس مجموعہ کے تارے غیر معمولی بُعد کی وجہ سے آپس میں ملے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حتی کہ ہر تارے کا علحدہ علحدہ دیکھنا ہمارے لئے قطعاً متعذر رہے۔ اس کے بعد سترہویں صدی کے آخر میں سر نیوٹن نے دوربین عاکس ایجاد کی، اسی دوربین کے ڈیڑھ سو برس بعد پھر بڑی بڑی دوربینیں ایجاد کی گئیں لارڈ رس نے انکی بڑی دوربینوں کے ذریعہ سے تحقیقات کی تو اس کو معلوم ہوا کہ وہ سدیم، جو کوکبۂ سلاقین میں ہے۔

ایک مضبوط ٹلسکوپ سے دیکھنے پر حلزونی شکل میں کواکب متنظمہ کا ایک مجموعہ دکھائی دیتی ہے، موصوف کے اس انکشاف کے بعد سدیم کی تحقیقات کا درس منقطع ہوگیا اور جدید سدیم کے انکشاف کی بحث چھڑ گئی، اسوقت سدیم جدیدہ کا انکشاف، علماء فلکیات کا سب سے بڑا کارنامہ کہا جاتا ہے، چنانچہ اسوقت تک ماہرین فن کی پیہم کوششوں سے سینکڑوں سدیم منکشف ہوچکے ہیں۔

ابھی علماء فن، سدیم کی اس کافی مقدار کا انکشاف نہ کرچکے تھے کہ خود ان میں سدیم کی حقیقت کے اندر اختلاف شروع ہوگیا، کہ کیا یہ تاروں کا کوئی مجموعہ ہے، جو اپنی غیر معمولی بُعد کے باعث بادل کی شکل میں نظر آتا ہے؟ اور پھر جب کسی قوی ٹلسکوب سے اس کی طرف دیکھا جاتا ہے تو اسکے واقعی اجزاء دکھائی دیتے ہیں؟ یا وہ ایسے غیوم (ابر) ہیں جو آس پاس کے ستاروں کی روشنی سے روشن ہیں؟ یا وہ ملتہب گیسیں ہیں جو فضا کے اندر بکھری ہوئی ہیں؟

ان سوالوں کے جواب میں سر ولیم ھگنز نے یہ ثابت کیا کہ:۔ "بعض سدیم دراصل بہت سے تاروں کا مجموعہ ہیں، لیکن غیر معمولی بعد کی وجہ سے وہ صرف چند تارے دکھائی دیتے ہیں۔ اور بعض فی الحقیقت ملتہب گیسوں کی ایک سحابی چادر ہیں، اور اُنکے خطوط نور، ان گیسوں کے خطوط کے مماثل ہیں، جو اپنی غیر معمولی حرارت کے باعث دوسری گیسوں سے ممتاز ہیں۔

وہ گیسیں، جن سے سدیم بنتے ہیں، جب حرارت اور حدت کی انتہائی درجہ پر پہونچ جاتی ہیں تو ان سے شعاعیں نکلتی ہیں ماہرین طبقات نے یہ ثابت کیا ہے کہ:۔ "سدیم میں ہیڈروجن اور ہلیم کے عناصر بہت کافی اور کاربن اور نائٹروجن کے بہت کم ہیں، اسکے علاوہ ایک ایسا عنصر بھی اس میں پایا جاتا ہے جس کا مثل عناصر ارض میں کہیں نہیں ملتا، اس جدید عنصر کا نام ماہرین فن نے بنوکیسیم رکھا ہے۔

لیکن ہر سدیم یکساں نہیں ہے، بعض سدیم اس نور سے منور ہوتے ہیں، جو فضا کے اندر دوسرے ستاروں سے پیدا ہوکر اس پر منعکس ہوتا ہے، اور بعض سدیم چند اپنی طرف آنیوالے کواکب سے نور کا اقتباس کرتے ہیں۔ علامہ برنار امریکی نے محض تحقیقات سدیم کے لئے اپنے آپ کو وقف کردیا ہے، موصوف آج کی گھڑی تک ۱۰۰ انئی سدیموں کا سراغ لگانے میں بالکل کامیاب ہوچکے ہیں۔

جو اجرام سماویہ سدیم کے نام سے پہچانے جاتے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں، ایک ملتہب گیسوں کے غیوم، دوسرے سدم لولبیہ وغیرہ، اور یہ سدیمیں زیادہ تر نجوم کے چھوٹے بڑے مجموعے ہیں، جو غیر معمولی دوری کے سبب پر کالۂ ابر کی شکل میں نظر آتے ہیں،

پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ سدیم لولبیہ نجوم کے مجموعے ہیں اور چاروں طرف سے ہمارے آفتاب کو محیط ہیں، لیکن جب رصد و تصویر اور حل طیفی کے آلات زیادہ مکمل ہوگئے تو علماء فن کو یہ معلوم ہوا کہ سدیم اپنے غیر معمولی وسعت کے سبب ہمارے نظام شمسی کے ساتھ قیاس نہیں کی جاسکتیں، بلکہ سدیم کا ہر تارہ ہمارے مجرّہ (کہکشاں) کے مانند خود ایک مستقل عالم ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہوا کہ فضا کے اندر ہزاروں سدیم لولبیہ ہیں۔ اور ہر ایک کی وسعت ہمارے مجرّہ کی وسعت کے برابر ہے۔ اور ہر سدیم الگ الگ واقع ہے، کوئی کسی کے ضمن میں نہیں ہے امریکہ کے مشہور علماء فلک ان کو عوالم جزری کے نام سے موسوم کرتے ہیں،

اس حیثیت سے بھی سدیم کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو ہمارے مجرہ کے اندر داخل ہیں، دوسرے وہ جو اس سے خارج ہیں، حقیقت میں ہمارا مجرّہ سدیم غازیہ اور نجوم متفرقہ کا ایک مجموعۂ عظیم ہے، یہ مجرّہ ان سینکڑوں کواکب پر بھی مشتمل ہے جو آنکھوں سے

نظر آتے ہیں، اور ان ہزاروں کواکب پر بھی مشتمل ہے جو ٹلسکوب (دوربین) سے دیکھے جاتے ہیں، اور ان لاکھوں کواکب پر بھی مشتمل ہے جو محض فوٹوگرافی آلہ سے معلوم ہوتے ہیں۔

مرصدِ مجرہ کے تمام معروف وسائل رصد کی وساطت سے یہ ثابت ہوا ہے کہ مجرّہ عدسی شکل کا ایک قرص ہے جس کے قطر کا طول تقریباً ہزار برس نوری اور جس کا سمک (عرض) بیس ہزار برس نوری ہے، اور ہمارا نظام شمسی تقریباً اسی کے وسط میں واقع ہے، اور اس قرص کی فضا میں تقریباً ۳۰ ہزار ملین تارے مختلف مسافتوں پر پھیلے ہوئے ہیں، لیکن غیر معمولی دوری کیوجہ سے وہ لطخۂ سحابیہ کے مانند نظر آتے ہیں، کوکبۂ رامی اور کوکبۂ ہرقل میں اس قسم کے بادل اکثر دیکھے جاتے ہیں۔

جو سدیمین، مجرہ کے باہر ہیں، وہ اصل میں، غیوم غازیہ ہیں جو مجرہ کے باہر فضا میں اسی طرح بکھری ہوئی ہیں جسطرح ناپیدکنار سمندروں میں جزائر پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، جن سرگرم علماء نے ان سدیم کے درس و تحقیق پر توجہ کی، ان میں سب سے زیادہ مشہور علامہ ہبل امریکی جبل ولسن کی رصدگاہ کا نامور عالم ہے، موصوف نے مجلۃ الاسٹروفزکس (علم الفلک الطبیعی) میں ایک مضمون شائع کیا ہے، جس میں آپ نے چار سو سدیم کے متعلق بحث کرنے کے بعد جو نتیجہ نکالا ہے، اس کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے کہ:۔

"ان سدیموں میں بعض غیر منتظم شکل کی سدیم ہیں، یعنی ان کی کوئی خاص قیاسی شکل نہیں ہے، اور انمیں سب سے زیادہ مشہور وہ سدیم ہے جو غیوم مجلان کے نام سے پہچانی جاتی ہے، اور کرۂ جنوبی کے وسط میں (اتنی قریب) نظر آتی ہے۔ کہ مدراس کا دیکھنے والا بادی النظر میں یہ سمجھتا ہے کہ وہ گویا "درب لبتان" کا ایک جزو ہے، حالانکہ واقع میں وہ اس سے بہت زیادہ دور ہے۔ باقی وہ سدیم جنکی ایک مخصوص شکل ہے، ان غیر منتظم الشکل سدیم بہت تعداد میں زیادہ ہیں۔ اور ان سدیموں کا بیشتر حصہ یا تو اہلیلجی شکل کا ہے یا لولبی شکل کا! السپکٹروسکوپ کے ذریعہ اہلیلجی سدیم کے نور کی جو تحلیل کی گئی تو اس سے ثابت ہوا کہ وہ ایک حد بعید تک ہمارے مجرہ کے مماثل ہے۔ اور مجرہ ہی کے مانند نجوم کا ایک مجموعہ بھی ہے۔ نجوم کی فرداً فرداً تفریق لیکن غیر معمولی بعد کے باعث متعذر اور محال ہے۔ مزید تحقیقات سے ثابت ہوا کہ بعض سدیم اہلیلجی شکل سے لولبی شکل کی طرف منتقل ہو رہی ہیں۔ اور بعض سدیم لولبیہ میں وہ مخصوص نشانات ظاہر ہو رہے ہیں جو عادۃً ان سدیموں میں ظاہر ہوا کرتی ہیں۔ ماہرین فن نے ان سدم کے ابعاد کا قیاس کیا تو ثابت ہوا کہ کوکبۂ مراۃ المسلسلہ کی سدیم کبیر کا بُعد تقریباً ۹۰۰ ہزار برس نوری ہے۔ اور وہ سدیم لولبی جو کوکبۂ مثلث میں ہے وہ بھی تقریباً اتنی ہی دور ہے۔ علاوہ ازیں ہزاروں سدم لولبیہ ہیں جو بیسیوں ہزار برس کی دوری پر واقع ہیں۔ استاذ ہبل اور استاذ ہیجلی کی تحقیقات سے یہ معلوم ہوا کہ کوکبۂ شعر برنیکی اور کوکبۂ سنبلہ کی سمت میں ایک ایسی سدیم ہے جس کا بُعد ۱۰۰ ملین نوری برس سے کم نہیں ہے۔

ان فضائی سدم کی حرکت کی معرفت کے لئے السپکٹروسکوپ کا استعمال کیا گیا تو ظاہر ہوا کہ مراۃ المسلسلہ کی سدیم ۳۰۰ کیلومیٹر فی منٹ کی رفتار سے ہمارے مجرہ کی طرف بڑھ رہی ہے اور اکثر سدم لولبیہ ۶۰۰ کیلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اور دور ہوتے جاتے ہیں۔

ان سدموں کی جرم کی واقعی معرفت کیلئے باحثین فن نے جو طریقے ایجاد کئے ہیں، وہ اسقدر مشکل ہیں کہ اس مقام پر انکو بسط سے بیان کرنا از بس دشوار ہے۔ اسلئے ہم انکی تفصیل کو نظر انداز کرتے ہیں، لیکن ان طریقوں کے تطبیق سے یہ اخذ کیا جاتا ہے کہ کوکبۂ مراۃ المسلسلہ کی سدیم کا جرم ہمارے آفتاب کے جرم سے دو ہزار ملین گنے کے برابر ہے۔ اور یہ سدیم ۱۷ ملین برس کے بعد ایک مرتبہ گردش کرتی ہے۔ حالانکہ ہماری زمین ہر چوبیس گھنٹے کے بعد ایک مرتبہ گردش کرتی رہتی ہے۔

بدر اصلاحی

# مطبوعاتِ موصولہ

## تلاشِ حق

"مہاتما گاندھی کی آپ بیتی" جو اُنکے گجراتی اخبار اور ینگ انڈیا میں مسلسل شائع ہو چکی ہے، اسقدر مشہور چیز ہے کہ اس کا تعارف کرانا بے معنی سی بات ہے۔ انگریزی میں اس کی اشاعت کتابی صورت میں میکملن کمپنی نے کی ہے۔ اور اب تلاشِ حق کے نام سے اس کا اُردو ترجمہ ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی نے کیا ہے۔

جس طرح اصلی کتاب تعارف کی محتاج نہیں، اسی طرح ترجمہ کے متعلق اظہارِ خیال کی ضرورت نہیں کیونکہ جس پایہ کی کتاب ہے اُسی مرتبہ کا مترجم اُسے ملا۔ یہ کتاب دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور دو روپیہ میں جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی سے مل سکتی ہے۔ وہ لوگ جو مہاتما گاندھی کی سیرت، موجودہ سیاسیات کی تاریخ، اور حقگوئی کی بہترین مثال دیکھنا چاہتے ہیں، ان کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اور اس لحاظ سے بھی کہ وہ عہد حاضر کے سب سے بڑے انسان کے خیالات ہیں۔ قابلِ غور و مطالعہ ہیں۔

## مضامینِ فرحت

مرزا فرحت اللہ بیگ ملک کے اُن انشا پردازوں میں سے ہیں، جن کے متعلق دو رائیں نہیں پائی جاتیں۔ ان کے مضامین میں زبان و انشاء کا لطف ہلکے ہلکے مزاح کے ساتھ ملا ہوا اس قدر دلکش ہوتا ہے کہ ہر طبقہ میں اُس کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جانا چاہیئے۔

کتاب زیرِ تنقید ان کے مضامین کا دوسرا حصہ ہے۔ جس میں پہلا مضمون وہی ہے جو نگار کے ظرف نمبر میں پھول والوں کی سیر پر اُنھوں نے لکھا تھا۔ اس کے بعد بارہ مضمون اور ہیں جو مختلف عنوانوں پر لکھے گئے ہیں، لیکن حکیم آغا جان عیش پر جو مقالہ تحریر ہوا ہے وہ کاوش و تحقیق اور تنقید صحیح کا بہت پاکیزہ نمونہ ہے۔ الغرض وہ لوگ جو دہلی کی زبان اور اُس کے چٹخاروں کے ساتھ ساتھ کچھ کام کی باتیں بھی سننا چاہتے ہیں، اُن کو یہ مجموعہ ضرور دیکھنا چاہیئے، جو نفیس طباعت و کتابت کے ساتھ ۲۰۰ صفحات پر شائع ہوا ہے اور دو روپیہ میں خود مصنف سے ہوم ڈپارٹمنٹ حیدر آباد دکن کے پتہ پر مل سکتا ہے۔

## قدیم افسانے

مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن نے ایک سلسلہ "دنیا کے شاہکار افسانے" کے نام سے جاری کیا ہے جس کا پہلا حصہ "قدیم افسانے" کے نام سے ہمارے سامنے ہے۔ اس میں قدیم مصری، یونانی، رومی، ہندی، ایرانی اور عربی مختصر افسانوں کا اقتباس ہے، جسے مولوی عبدالقادر سروری ایم۔ اے نے کیا ہے۔ اسی طرح اس سلسلہ کے ۱۳ حصے اور ہوں گے۔ جو مختلف حضرات کے مرتب کئے ہونگے۔ چودھواں حصہ اُردو افسانوں کا ہوگا اور

یہ بھی جناب سروری کے اقتباس کا نتیجہ ہوگا۔

ظاہر ہے کہ اس سلسلہ کے مفید وکار آمد ہونے میں کسی کو کیا شک ہوسکتا ہے اور مکتبۂ ابراہیمیہ کی اس خدمت زبان سے انکار کی گنجائش کہاں؟ البتہ بحث اسمیں ضرور آکر پڑے گی کہ جن افسانوں کا انتخاب کیا گیا ہے وہ حقیقتاً اس کے مستحق تھے یا نہیں اور جن کو چھوڑ دیا گیا ہے ان میں سے کون کون انتخاب کے قابل تھے۔ لیکن اس نزاع سے اصل تجویز کی افادیت کو کوئی صدمہ نہیں پہونچتا اور اگر اختلاف رائے کی وجہ سے کسی کو پس وپیش ہو، توکبھی کوئی کام اس قسم کا انجام نہیں پاسکتا

یہ کتاب ایک روپیہ میں مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد سے مل سکتی ہے۔

## حافظ شیراز

اس کتاب میں مولوی سید یوشع بی۔ اے نے جو متوسلین دکن میں سے ہیں، حافظ کی شاعری پر خود اُس کے شعروں سے مدد لیکر تنقید کی ہے۔ یعنی اُنھوں نے ظاہر کیا ہے کہ حافظ خود اپنی شاعری کے متعلق کیا رائے رکھتا تھا۔ یہ مقالہ اسلوب بیان وندرت گفتگو کے لحاظ سے اچھا ہے، لیکن استقصاء کے لحاظ سے ناقص۔ امید ہے کہ دوسرے اڈیشن میں اسکی تکمیل کی طرف زیادہ توجہ کیجائیگی۔ اسکو بھی مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد نے شائع کیا ہے اور قیمت [illegible] رکھی گئی۔

## بغاوت عرب اور لارنس

مشرق ادنےٰ کی موجودہ سیاسیات کی اہمیت سے کرنل لارنس کی مشہور ہستی کو جتنا تعلق ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، لیکن شاید یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ کرنل لارنس نے کس کس طریق پر اور کن کن تدابیر سے وہاں کی سیاسیات کا رُخ بدلا اور اُس کی ایک ہستی نے سرزمین عرب میں کیسے کیسے انقلاب برپا کئے۔ مولوی چراغ حسن صاحب حسرت نے اس کتاب شریف حسین کی بغاوت کے اسباب اور کرنل لارنس کے کارناموں سے ایسی دلچسپ اور محققانہ گفتگو کی ہے کہ مشکل ہی سے کسی ایک جگہ یہ تمام معلومات نظر آسکتی ہیں۔ اسمیں تمام وہ جاسوسیاں لارنس کی ظاہر کی ہیں جو عراق میں اسنے کیں جو سقوط عقبہ کا باعث ہوئیں اور آخر کار جنھوں نے ترک وعرب کے درمیان اختلاف وعناد کی آہنی دیوار قائم کردی۔ کتاب مجلد معہ چند تصاویر کے شائع کی گئی ہے اور ایک روپیہ میں اُردو کتب خانہ لاہور سے مل سکتی ہے۔

## انجیل وقرآن کا مطالعہ

ٹمکور علاقہ بنگلور میں ایک صاحب محمد عبداللہ ہیں جو اپنے نام کے ساتھ "مثیل انبیاء بنی اسرائیل" بھی لکھتے ہیں۔ انھوں نے یہ کتاب بشارت خداوندی کی بناء پر تحریر فرمائی ہے۔

اس کتاب کا موضوع اُسکے نام سے ظاہر ہے۔ اور ۸ر میں غالباً مصنف سے مل سکتی ہے۔

## روزنامچہ مقدس

اخبار نیر اعظم مراد آباد کے اڈیٹر وپروپرائٹر نے حال ہی میں بسلسلۂ حج زیارت وعتبات عالیات کا شرف بھی حاصل کیا تھا۔ اس سیر وسیاحت کے تمام حالات اُنھوں نے روزنامچہ مقدس کے نام سے شائع کئے ہیں۔ ہمنے اس روزنامچہ کو پڑھا اور دلچسپ ومفید پایا۔ بہت لوگوں نے اس قسم کے سفرنامے لکھے ہیں۔ جنمیں سے بعض کو امتیازی درجہ حاصل ہوا اور یقیناً حق تلفی ہوگی اگر روزنامچہ مقدس کو انھیں امتیازی سفرناموں میں جگہ نہ دیجائے۔

یہ مقدس کتاب عہ میں دفتر نیر اعظم مراد آباد سے مل سکتی ہے۔

**دنیا کی حور**

جناب کوثر چاندپوری کا ایک افسانہ ہے جو چھوٹی تقطیع کے ۹۰ صفحات پر شائع ہوا ہے۔ اسکا موضوع معاشرتی اصلاح ہے اور مجھے یہ دیکھکر مسرت ہوئی کہ جناب کوثر اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں، زبان صاف و سلیس، پلاٹ دلکش اور اسلوب بیان اچھا ہے۔ قیمت دس آنے۔ ملنے کا پتہ جناب حکیم کوثر چاندپوری۔ بیگم گنج۔ ریاست بھوپال۔

**پیمانۂ محبت**

جناب ہمدم کے مجموعۂ غزلیات پر شاید اس سے پہلے نگار میں ذکر آچکا ہے۔ یہ تصنیف بھی آپ ہی کی ہے جسمیں غالب کی چند غزلوں کی تضمین کی ہے اور کچھ غزلیں اور رباعیاں اپنی بھی آخر میں شامل کر دی ہیں۔ جناب ہمدم کا ذوق تغزل پاکیزہ ہے اور اُن کی شاعری کا عنصر غالب جذبات نگاری ہے۔ یہ پیمانہ ایک روپیہ میں دفتر اخبار ملت کے کراچی سے ملسکتا ہے جسکی ادارت آجکل جناب ہمدم ہی کے ہاتھ میں ہے۔

**باب الانعام**

مولوی انعام الرحمٰن صاحب سہارنپوری نے ایک رسالہ اس نام سے لکھا ہے جسمیں بعض اخلاقی مسائل پر گفتگو کی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اسمیں سفید بال اُکھاڑنے اور ازار کا پائنچہ دراز رکھنے کا بھی ذکر ہے۔ یہ رسالہ اسی قدیم مولوی ذہنیت کا نتیجہ ہے جو اخلاق کو صرف نظریہ کی حد تک رائج کرنا چاہتی ہے اور کام کی باتوں سے زیادہ بیکار باتوں میں اپنا وقت ضائع کرنا پسند کرتی ہے۔ اس رسالہ کی قیمت ۱ر رکھی ہے۔ جو بہت زیادہ ہے۔ ملنے کا پتہ۔ پیرجی انعام الرحمٰن کٹرہ دنیا بیگ خاں بازار لال کنواں دہلی ہے۔

**تعلیم الرحمان**

یہ بھی جناب انعام الرحمٰن صاحب تالیف ہے۔ جسے باب الانعام کا دوسرا حصہ کہنا چاہئے۔ اسمیں بھی معمولی مسائل درج ہیں اور وہی انداز بیان ہے جو کسی وقت کیمیائے سعادت سے شروع ہوا تھا اور بعد کو جس نے نورنامہ کی صورت اختیار کرلی۔ اس کی قیمت اور زیادہ۔ یعنی ۱۲ر رکھی گئی ہے۔ ملنے کا پتہ وہی ہے۔

**الجہاد فی الاسلام**

مولوی ابوالاعلیٰ صاحب مودودی۔ اعزازی رکن دارالمصنفین اس کتاب کے مصنف ہیں۔ متفقہ طور پر سب نے اس کتاب کو اسکے موضوع کے لحاظ سے بہت جامع و مکمل تصنیف قرار دیا ہے۔

جہاد تاریخ اسلام کا نہایت مہتم بالشان مسئلہ ہے اور مخالفین نے جس جس رنگ سے اسکو پیش کیا ہے۔ وہ بھی اہل نظر سے مخفی نہیں۔ لیکن مولوی ابوالاعلیٰ صاحب نے اس کتاب میں تاریخ و مذہب، اقتصاد و معاشرت، نفسیات و سیاسیات ہر لحاظ سے نہایت مکمل بحث اس موضوع پر کی ہے اور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ پر ایسی جامع تصنیف اُردو کیا معنے کسی اور زبان میں بھی نہ تھی۔ یہ کتاب شاید دو روپیہ میں مولوی ابوالخیر صاحب مودودی رکن دارالترجمہ حیدرآباد سے مل سکتی ہے۔

**ڈراما ضحاک**

پنجاب اُردو اکاڈیمی کی پہلی کتاب ہے، جسے ملک کے مشہور ادیب اختر شیرانی نے اُردو منتقل کیا ہے۔ میں نے جابجا سے اسکو دیکھا اور ترجمہ کو بہت شگفتہ و دلچسپ پایا۔ یہ اکاڈیمی میاں محمد اسلم خاں صاحب ایم۔ اے (کنٹب)، بیرسٹرایٹ لا کی نگرانی میں قائم کی گئی ہے، جو رائل سوسائٹی آف آرٹس کے فیلو بھی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ایسے فاضل شخص کی نگرانی میں جو یورپ کی کئی زبانوں کا ماہر ہے اکاڈیمی قابل قدر خدمات انجام دے گی۔

اس کتاب کا حجم ۱۸۲ صفحات کا ہے۔ طباعت کتابت معمولی ہے۔ اور قیمت عمر مقرر کی گئی ہے۔

# حسیات

(اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی)

کر گئی مست ہوائے سحر و شام مجھے　　ہو گیا رنگ شفق بادۂ گلفام مجھے
خواہش حور نے زاہد کو کہیں کا نہ رکھا　　لے گئی تا لب کوثر طلب جام مجھے
ہے قیامت میں یہ خورشید قیامت کا ظہور　　یا کوئی دیکھنے آیا ہے لب بام مجھے،
مثل سیماب سکوں ہی مری فطرت میں نہیں　　تم بھی چاہو تو میسر نہ ہو آرام مجھے،
ہو گیا باغ کا ہر ذرہ شناسائے رموز　　ہر کلی دینے لگی ہے ترا پیغام مجھے
ان کے الطاف نے تو اور بھی بیتاب کیا　　ہو گئے وصل کے دن ہجر کے ایام مجھے،

صورت نخل ارم قاتل سرکش ہے نظیر
موج تسنیم ہے آب دم صمصام مجھے،

# بیان حسن

(کوکب شاہجہاں پوری)

دل نے اگر کیا کبھی حوصلۂ بیان حسن　　شعلۂ آہ بن گیا سرخی داستان حسن
سجدۂ شیخ خود نما موجب داغ ناصیہ　　نقش سجود عشق ہے زینت آستان حسن
جرأت دل کا راز ہے ہمت عشق میں نہاں　　ورنہ کہاں میں خستہ جاں لائق امتحان حسن
دیر و حرم کے شوق میں محو ہیں شیخ و برہمن　　میری جبین عشق ہے اور ہے آستان حسن
عشق کے سارے حوصلے ختم ہوئے اک آہ پر　　تیر قضا سے کم نہ تھا غمزۂ جاں ستان حسن
بہر نظارہ چاہیئے چشم حقیقت آشنا　　خاک کے ذرہ ذرہ سے جلوہ نما ہے شان حسن
پوچھیئے مست عشق سے کیفیت مئے الست　　عالم عقل و ہوش میں کون ہے رازدان حسن

سوز و گداز عشق بھی کتنا کرشمہ ساز ہے
ذرۂ خاک بن گیا کوکب آسمان حسن،

# رُباعیاتِ آسی

گو دورِ سرور و خرمی ہے ساقی
فانی ہے خوشی تو کیا خوشی ہے ساقی
جس جام سے تو پلا رہا ہے مجھ کو
جانے کتنوں نے اس سے پی ہے ساقی

---

رونے پہ کہیں نہ چشم حیرت آ جائے
سامانِ قرار پر نہ آفت آ جائے
فردا پہ نہ رکھیئے اپنے دیدار کی شرط
ممکن ہے کہ آج ہی قیامت آ جائے

---

چھوڑی ہوئی خو کو چھوڑتا ہوں میں ابھی
ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑتا ہوں میں ابھی
پیمانہ مری طرف بڑھا دے ساقی
پیمانۂ صبر توڑتا ہوں میں ابھی

---

اے واعظِ خوش بیان مجھے تنگ نہ کر
باتوں کا ترے نہیں مرے دل پہ اثر
آئیوالا نہ کوئی جانے والا
پھر کس سے سُنی بہشت و دوزخ کی خبر

---

اس سمت ہے کعبہ اسطرف ہے مندر
تسبیح اِدھر ہے اور زنار اُدھر
اے بیخبرِ مآلِ سیرِ ہستی
جانا ہے کسی طرف تو جا دیر نہ کر

---

بیکار ہیں واعظوں کی یہ سب باتیں
ہیں مکر و فریب کی یہ ساری گھاتیں
روزِ محشر کا خوف کیا ہے آسی
ایسی تو گزار دیں ہیں لاکھوں راتیں

---

وہ دولت و مرتبت کہاں سے آئے
وہ ثروت و مقدرت کہاں سے آئے
دریائے شراب ؟ بہتا ہے مگر
پیمانۂ معرفت کہاں سے آئے

---

آسی

# غزلیات

(احمد علی خاں شاؔد عارفی رامپوری)

حسن جتنا تجھے ذوقِ ستم آرائی دے
عشق اُتنا ہی مجھے درسِ شکیبائی دے

مطمئن ہو کے میں انجامِ محبت سوچوں
ہاں اگر دردِ جگر رخصتِ تنہائی دے

نہ یہ مطلب ہے کہ ہو قدرِ نیازِ اُلفت
نہ یہ منشا ہے کوئی اجرِ جبیں سائی دے

دل کو عنوانِ محبت پہ تصدق کر کے
اور کیا نذر تجھے تیرا تمنائی دے

یہ تو میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ کعبہ ہے یہ دیر
ان میں تو مجھکو نظر آئے وہ بینائی دے

قتل میرا تجھے آسان ہے لیکن قاتل
تیری شہرت نہ تجھے مژدۂ رسوائی دے

لطف یہ ہے نہ کسی کا وہ شناسا نکلے
ذرہ ذرہ جسے پیغامِ شناسائی دے

شاؔد بے شبہ میں اُس آنکھ کا دیوانہ ہوں
جان جب آنکھ پہ ہر آہوئے صحرائی دے

---

طور پر جلوہ دکھایا بت کدہ میں مل گئی مجھے
مدعا یہ ہے کہیں تسکین ہو حاصل مجھے

آبلہ پائی نہ دے ایسے میں تکلیفِ قیام
وقت کم ہے اور جانا ہے کئی منزل مجھے

چاہتا ہوں اور نہیں پاتا سکونِ اضطراب
ڈھونڈھتا ہوں اور نہیں ملتا نشاطِ دل مجھے

اے نگاہِ یاس تو ہی ترجمانِ درد بن
کہہ رہے ہیں وہ سناؤ داستانِ دل مجھے

میں تمہارے سنگِ در کو چھوڑنے والا نہ تھا
تم نے کب سمجھا کسی لائق کسی قابل مجھے

اور بڑھتی جا رہی ہے ہمت مشکل پسند
ہاں سناؤ داستانِ دوریٔ منزل مجھے

دیکھتا ہوں جب کہیں بھی گرمیٔ بزمِ نشاط
یاد آجاتا ہے وہ ہنگامۂ محفل مجھے

شاؔد یہ مشق تصور نے صفائی قلب کی
صاف آتا ہے نظر اُس بت کا اک اک تل مجھے

# غزلیات

## عشق رامپوری

وہ تو اپنی برش تیغ نظر دیکھا کئے
کون کہتا ہے مرا زخمِ جگر دیکھا کئے

سامنے اونکے نہ آیا کچھ ہمیں بنکر جواب
اُن کا منھ حیرت سے ہر ہر بات پر دیکھا کئے

اونکو نخوت تھی ادھر لب بند رعب حسن سے
وہ ہماری اور ہم اونکی نظر دیکھا کئے

اب سرِ محفل نہیں معلوم کس امید پر
چُپکے چُپکے ہم نگاہ فتنہ گر دیکھا کئے

جھوٹ ہی سے کچھ قرار دل ہوا اس امید پر
ہم فریب گفتگوئے نامہ بر دیکھا کئے

وقت آخر یاس کی تصویر تھا بیمارِ غم
دم بخود بیٹھے ہوئے سب چارہ گر دیکھا کئے

عشق کیا امید وعدہ تھی کہ جسپر رات بھر
ٹکٹکی باندھے ہوئے ہم سوئے در دیکھا کئے

## شاد صابری

سعی لاحاصل بھی قسمت سے مجھے حاصل نہیں
وائے بدبختی کہ علم دورئے منزل نہیں

ذوق بیتابی کے قابل کوئی اہل دل نہیں
دل بہت لیکن کسی میں جذبہ کامل نہیں

جلوہ تاباں کا اک موہوم سا خاکہ ہو نہیں
جلوہ گر مجھ میں نقوشِ ہستئ باطل نہیں

پوچھتی ہیں عشق سے اکثر مری مایوسیاں
اے متوج خیز دریا، کیا ترا ساحل نہیں

جستجوئے منزلِ مقصود میں ہوں گامزن
ہمسفر تو جسکو سمجھا وہ مری منزل نہیں

حسن میں موجود ہے پیرایۂ دلبستگی
قابل عنواں مگر ارمان اہل دل نہیں

ہر متوج دامن ساحل نظر آیا مجھے
جب ہوا ظاہر کہ بحرِ عشق کا ساحل نہیں

منزلِ مقصود ہے ہر منزلِ راہ طلب
دامنِ رہبر پہ داغ حسرت منزل نہیں

ہوشیار بیخودی کو عقل دیتی ہے سبق　　واقف معنی نہیں جو آپ سے غافل نہیں
شاد تھک کر بیٹھنے کا قصد جب میں نے کیا
شوق نے بڑھ کر ندا دی یہ مری منزل نہیں

## خلیق فیض آبادی

دلِ بیتاب مدت سے رہینِ یاس حرماں تھا　　خبر کیا تھی انھیں پردوں میں تو بھی آکے پنہاں تھا
غلط سمجھا تھا میں تیرِ نگاہِ ناز کو قاتل　　مجھے بسمل کیا جس نے وہ خود میرا ہی ارماں تھا
نگاہیں جھک گئیں اُنکی جو میری عرضِ حسرت پر　　مجھے محسوس ہوتا تھا کہ گویا میں پشیماں تھا
خلیق غمزدہ کو چھیڑ کر کیا پا گیا ظالم!
کہ وہ ہر رنگ میں خود ہی مثالِ شمعِ سوزاں تھا

## جگر بسوانی

جب میں کہتا ہوں نہیں مجھ پہ عنایت تیری　　یہ صدا کان میں آتی ہو کہ قسمت تیری
ہم کو دھوکا یہی ہوتا ہے کہ بیدار ہیں ہم　　دیکھتے ہیں جو کبھی خواب میں صورت تیری
دوست کا دوست ہے کیوں ہم اُسے دشمن سمجھیں　　آج کل جسپہ زیادہ ہے عنایت تیری
دیکھ لے تجھکو تو جینا ہو خوشی سے دشوار　　جسکی آنکھوں میں پھرا کرتی ہے صورت تیری
دل پہ بڑھتے گئے جتنے ستم و جور و جفا　　دل میں بڑھتی گئی اتنی ہی محبت تیری
سامنا ہوگیا جب ہوش ہوئے گُم اپنے　　ہم نے جی بھر کے نہ دیکھی کبھی صورت تیری
دل گم زلف میں ہے یا تری مٹھی میں ہے　　کچھ بتاتی نہیں چتون کی شرارت تیری
ہم کو ہر نقش میں تیرا ہی نشاں ملتا ہے　　شکل کوئی ہو نظر آتی ہے صورت تیری
آخری آہ نے افشا کیا رازِ اُلفت　　عمر بھر ہم نے چھپائی تھی محبت تیری
اپنے بیمار سے وہ پوچھ رہے ہیں ہنس کر　　آج کیا حال ہے کیسی ہے طبیعت تیری
دلِ بیتاب شبِ غم ہو تیری عمر دراز　　اب رفاقت مری تو کر میں رفاقت تیری
دیہاں توبہ کا جگر میکدے والو مئیں کہاں
ایک چُلّو میں بدلجاتی ہے نیت تیری

## باسط بسوانی

دمِ آخر تجھے اے رشکِ مسیحا دیکھا
دیکھا بیمارِ محبت نے مگر کیا دیکھا

جان پر کھیل کے پھر آنکھ لڑائی تم سے
تم نے آئے ہوئے دل کا یہ تقاضا دیکھا

کنجِ زنداں میں خبر موسمِ گل کی پا کر
ہم نے حسرت سے بہت جانبِ صحرا دیکھا

کام آتا نہیں ہنگامِ مصیبت کوئی
اُس نے منھ پھیر لیا جسکو شناسا دیکھا

جانبِ در بھی نظر۔ جان حزیں ہونٹوں پر
مرنیوالے نے بہت آپ کا رستہ دیکھا

آپ سے کیا کہیں۔ کچھ یاد ہے کچھ بھول گئے
خواب تھا۔ عہدِ جوانی بھی۔ اُسے کیا دیکھا

قیس و فرہاد ہوں یا وامق و باسط کوئی
کوچۂ عشق میں دیکھا جسے رسوا دیکھا

---


# طرزِ زندگی

## ہر دو حصہ

مصنفہ نسیم انہونوی اڈیٹر انکشاف لکھنؤ

یہ ایک افسانہ ہے، جو نسائی تعلیم و تربیت پر تصنیف کیا گیا ہے، اور جسقدر مفید و دلچسپ ہے اس سے کہیں زیادہ سبق آموز۔ اس کا ہر باب عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے لئے سامان دلچسپی ہونے کے ساتھ ہی انھیں دنیا کے نشیب و فراز سے بھی آگاہ کرتا ہے۔ غالباً اس مبحث پر اس سے زیادہ کامیاب کوئی کتاب آجتک لکھی نہیں گئی۔

اگر آپ نے آرڈر دینے میں تاخیر کی تو دوسرے اڈیشن کا انتظار کرنا ہوگا۔ قیمت حصہ اول عمر
حصہ دویم عـہر

**منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ**

# کیا آپ کو معلوم ہی کہ

## ترجمہ تاریخ ادب اُردو

چھپ کر تیار ہوگیا جس سے زیادہ مکمل اور جامع زبان اُردو کی کوئی تاریخ نہیں۔ تمام مشاہیر نظم و نثر کے تذکرے اونکے کلام کے نمونے اور سَو کے قریب مشہور ادیبوں کی تصاویر مع ایک زبردست انڈکس کے اس میں شامل ہیں۔ بہت ضخیم ہے۔ دو حصہ مجلد نہایت خوشخط چھپائی وکاغذ نہایت دیدہ زیب قیمت (لعہ) مترجمہ مرزا محمد عسکری صاحب بی۔ اے۔

**تذکرۃ الخواتین** تمام شاعرہ عورتوں کی نہایت مختصر سوانحعمری اونکا کلام۔ حالات۔ ایرانی اور ہندوستانی دونوں جگہ کی صنف نازک کے کلام کا بے مثل اور لاجواب مجموعہ۔ اس سے زیادہ مواد اس بارہ میں کسی تذکرہ نسواں میں نہ ملیگا۔ مولفہ مصور درد مولوی عبدالباری صاحب آسی قیمت عہ چھپائی وکاغذ نہایت عمدہ۔

---

**مذاہب الاسلام** عجیب وغریب کتاب ہے گویا ایک دریا کو کوزہ میں بند کردیا ہے۔ یعنی اسلام میں جتنے مذہب اور جتنے فرقے اور جس فرقے کے جو عقیدے اور رسمیں ہیں۔ جس فرقے کا جو بانی ہوا ہے۔ وہ سب اس میں نہایت واضح طور پر درج کئے ہیں۔ ممکن ہی نہیں کہ کوئی ایک صفحہ پڑھ کر بغیر ختم کئے کتاب کو چھوڑ دے۔ قیمت (للعہ)

---

**دیوان خواجہ میر درد** خواجہ میر درد کا درد واثر بھرا کلام نہایت خوشخط معہ اعلےٰ رنگین خوشنما ٹائٹل کے اس میں ایک مقدمہ مولانا عبدالباری آسی کا شامل ہے جو حقیقتاً ایک لطیف اضافہ ہے اوس میں خواجہ صاحب کے شاگردوں کے حالات وکلام کا نمونہ بھی دیا گیا ہے۔ قیمت (۱۲ر)

---

**دیوان خواجہ آتش** اس مرتبہ اس دیوان کو نہایت عمدہ کاغذ پر بعد صحت وصفائی کے بعد چھاپا گیا ہی۔ قیمت عہ

دیوان ذوق ۱۲ر    دیوان غالب معہ اضافہ کلام جدید ١ہر    کلیات ناسخ لبطرز جدید عہ

## مینجر نولکشور پریس صیغہ بکڈپو لکھنؤ